اسلام کا نظریۂ اعتدال اور اس کے اہم عناصر

ڈاکٹر یوسف القرضاوی

ایفا پبلیکیشنز

اسلام کا نظریۂ اعتدال

اور اس کے اہم عناصر

ڈاکٹر یوسف القرضاوی

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

نام کتاب	:	اسلام کا نظریۂ اعتدال اور اس کے اہم عناصر
مصنف	:	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
مترجم	:	الیاس نعمانی
صفحات	:	۷۱
سن طباعت	:	۲۰۱۴ء
قیمت	:	۵۰

ناشر

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

۱۶۱-ایف، بیسمنٹ، جوگا بائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸

جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

فون: 011-26981327

ای میل: ifapublication@gmail.com

فہرست

☆☆☆

پیش لفظ

ایک ایسے زمانے میں جب کہ قدریں پامال ہو رہی ہیں، اصولوں میں تبدیلی آرہی ہے اور انصاف، خیر و رواداری کے نشان ہائے راہ ہلکے ہوتے جا رہے ہیں، اصطلاحات کی تعیین، ان کے مطالب کی وضاحت اور ان کے متعلقہ مضامین پر سیر حاصل بحث بہت اہم مقام رکھتی ہے۔

ایسے کلی معاصر مسائل میں سے جو مسئلہ امت کو درپیش حالات میں سب سے زیادہ اہم ہے، اور جس کے شرعی، فکری، عقلی و علمی پہلوؤں کو اجاگر کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے وہ ''اعتدال'' ہے، اس لئے کہ یہ ایک شرعی منہج ہے، خیر اس سے وابستہ ہے، تہذیبی ڈھانچہ کی نمود اسی پر ہے، آج جب کہ فکری کارواں افراط وتفریط کا شکار ہے، تصورات اور موقفوں کی غلطیوں کا ازالہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

اسی لئے کویت کی وزارت برائے اوقاف واسلامی امور نے اپنے منصوبوں اور اپنی سرگرمیوں میں ''اعتدال'' کو نظریاتی وعملی طور پر ایک نمایاں مقام دیا ہے۔

اسی توجہ واعتنا کا ایک نتیجہ ''المركز العالمي للوسطية'' کا قیام ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ امت کے تہذیبی کارواں کے لئے ایک منارۂ نور بن کر مختلف علما وداعیوں کے فکری ومنہجی مطالعہ کے ذریعہ منہج اعتدال کی اصطلاح وتصور، نیز اس کے ضابطوں واصولوں کی اچھی طریقے پر تعیین کرے، شریعت کے ناقابل تغیر احکام پر کاربند رہ کر، زمانہ کی تبدیلیوں کی رعایت کرکے اور سرچشمہ کو مضبوط کرکے (جس کے زیر سایہ امت متحد رہتی ہے اور جو امت کے مقاصد میں یکسانیت لاتا ہے، اختلاف کا سلیقہ سکھاتا ہے، تہذیبی اشتراک کا دائرہ

وسیع کرتا ہے، اور ایک ایسی منصفانہ صحیح انسانی شراکت کے قیام میں تعاون کرتا ہے جو مثبت رویہ کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے اور تشخص کی حفاظت کا بھی پاس رکھتی ہے) ایک اکیڈمک نظریہ وجود میں لائے۔

سلسلہ "الأمــة الــوســط" بھی اسی کی ایک کڑی ہے، اس سلسلہ کے تحت مختلف مفکرین، علما اور داعیوں کی تحریریں منظر عام پر آرہی ہیں، یہ تحریریں اس منہج کو پختہ کرتی ہیں، امید ہے کہ یہ سلسلہ تہذیبی کارواں کے اصول منضبط کرے گا، اس کی جڑوں کو مضبوط کرے گا، خدا کرے کہ اس سلسلہ کے تحت افکار و نظریات کا ایسا تنوع سامنے آئے جو تصورات محکم کرے اور ان کو گوناگوں وسائل سے بہرہ ور کرے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اپنی فکر رسا سے ایک ایسا نظریہ سامنے لانے میں اپنا کردار ادا کریں جو مختلف خصوصیات کا حامل ہو۔

وما توفیقی الا باللہ

مقدمہ

الحمد لله حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه، والصلاة والسلام على خاتم النبيين محمدالذي أرسله الله رحمة ونعمة على المومنين ورضى الله عن آله وصحبه ومن اتبعهم باحسان الى يوم الدين۔ أما بعد!

اللہ تعالیٰ کا یہ مجھ پر احسان ہے کہ اس نے آغاز سے ہی مجھے فکر و منہج اعتدال کی پیروی نصیب فرمائی، یہ منہج میرے عقل وفہم اور اس تصوردین سے ہم آہنگ ہے جو میں نے اسلام کے صاف و بے داغ سرچشموں سے اخذ کیا ہے، اسی طرح یہ منہج اس زمانہ کے تقاضہ اور امت کی ضرورتوں کے بھی موافق ہے، آج جب کہ دنیا ایک گاؤں کی مانند ہوگئی ہے مسلمانوں کے دیگر قوموں سے تعلقات کے پہلو سے بھی یہ منہج مفید و مناسب ہے۔

اپنی پوری عمر میں نے اسی منہج کے نذر کردی ہے، میری فکر اور میرے وجدان کا مقصود یہی رہا ہے، محاضرات، خطبات، فتاوی، تدریس اور تربیت کے جتنے موقعے مجھے ملے (خواہ میں مسجد کے منبر پر ہوں، یا لیکچر ہال میں، تصنیف و تالیف میں مشغول ہوں یا ٹیلی ویزن چینلس اور انٹرنٹ پر موجود ہوں) میرا قلم اور میری زبان اسی منہج کے خادم رہے ہیں۔

اعتدال کے موضوع پر میں نے یہ چند صفحات لکھے ہیں، امید ہے کہ یہ کتابچہ اس نظریہ کی اشاعت، اس کی تصحیح اور اس کی تقویت کا ذریعہ بنے گا، اور مسلمانوں کے فہم، عمل، رویہ اور دعوت میں اس کے اثرات کو سامنے لائے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتابچہ میں میں نے اعتدال کے جن عناصر کا تذکرہ کیا ہے ان کی ایسی تشریح کی توفیق بھی مجھے دے جس میں اس کے فروع کو اس کے اصولوں سے مربوط کیا جائے، کتاب وسنت کے دلائل سے مدلل کیا جائے، اور عصر حاضر سے ان کے تعلق کو واضح کیا جائے۔ وماتوفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ أنیب۔

مغفرت کا طلبگار

یوسف القرضاوی

دوحہ

محرم ۱۴۲۸ھ/جنوری ۲۰۰۷ء

اعتدال کا مفہوم

بہت پہلے ہم نے اپنی کتاب "الخصائص العامة للاسلام "میں" اعتدال" کے مفہوم، اس کی خصوصیات اور اس کے مظاہر پر گفتگو کی تھی، اس کتاب میں ہم نے" اعتدال" (الوسطیۃ) کو اسلام کی نمایاں ترین خصوصیات میں شمار کیا تھا، اس کو" توازن" بھی کہا جاتا ہے، اس کا مطلب ہمارے نزدیک دو باہم متضاد پہلوؤں کے درمیان ایسا منصفانہ رویہ ہے جس میں کسی ایک سے صرف نظر کر کے صرف دوسرے کی ہی رعایت نہ کی جائے ،یعنی نہ افراط کا رویہ اختیار کیا جائے اور نہ تفریط کا۔

متضاد پہلوؤں کی چند مثالیں یہ ہیں: ربانیت و انسانیت، روحانیت و مادیت، فکر آخرت اور فکر دنیا، وحی اور عقل، ماضی پرستی اور مستقبل پرستی، فرد کے مفادات کی رعایت اور معاشرہ کے مفادات کی رعایت، حقیقت پسندی اور مثالیت پسندی، ثبات اور تغیر، وغیرہ وغیرہ۔

ان متضاد پہلوؤں کے درمیان توازن کا مطلب ہے ہر پہلو کو رَواحد تک گنجائش اور اس کا پورا پورا حق دینا، اور اس سلسلہ میں افراط سے بچنا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ "[رحمان:۷-۹] (اور آسمان کو اسی نے بلند کیا ہے، اور اسی نے ترازو قائم کی ہے کہ تم تولنے میں ظلم نہ کرو) یہ اعتدال ہی افراط و تفریط سے محفوظ رہتے ہوئے صحیح صحیح وزن (فیصلے) کرواتا ہے۔

ایک متوازن نظام کو وجود میں لانا انسان کے بس کا کام نہیں:

یہ منصفانہ توازن یقیناً انسان کی قدرت و استطاعت سے باہر کی بات ہے، اس لئے

کہ اس کی عقل محدود اور علم کوتاہ ہے، نیز وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے ذاتی، خاندانی، گروہی، علاقائی اور نسلی رجحانات سے متأثر ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انسانوں کا بنایا ہوا کوئی نظام یا منہج افراط وتفریط سے محفوظ نہیں ہوتا ہے، عصر حاضر اور تاریخ کا تجربہ یہی ہے۔

کسی بھی مادی یا معنوی وجود کو اس کا پورا پورا حق بے کم وکاست دینا صرف اس اللہ کے ہی بس کی بات ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کر کے اس کی صحیح مقدار کے مطابق وجود بخشا، جسے ہر چیز کا علم ہے، ہر چیز اس کے شمار میں ہے، اور اس کے علم ورحمت کے سایہ میں ہے۔

کوئی مقام حیرت نہیں کہ یہ زبردست توازن ہمیں اللہ کی تخلیق اور اس کے احکام دونوں میں جلوہ گر نظر آتا ہے، اللہ کی پیدا کردہ اس کائنات میں جس طرح یہ توازن ہمیں دکھتا ہے، اسی طرح اللہ کے احکامِ شرعیہ میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

تکوینی امور میں توازن:

اپنے گردوپیش پر ہم نظر ڈالیں تو ہمیں روز وشب، روشنی وتاریکی، سردی وگرمی، پانی، خشکی اور مختلف گیسیں نظر آتی ہیں، یہ سب ایک متعینہ مقدار وحساب کے ساتھ موجود ہیں، کوئی بھی دوسرے کی حدود میں دخل اندازی نہیں کرتا، اور اپنی مقررہ حد سے آگے نہیں بڑھتا۔

یہی حال فضا میں موجود سورج، چاند، ستاروں اور کہکشاؤں کا ہے، یہ سب اپنے مدار میں چلتے ہیں، کسی سے ٹکراتے نہیں، اپنے دائرہ سے باہر نہیں نکلتے، سچ کہا ہے اللہ تعالیٰ نے ''إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ'' [قمر:۴۹] (ہم نے ہر چیز کو ناپ تول کے ساتھ پیدا کیا ہے)، ''مَا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِن تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى مِن فُطُور'' [ملک:۳] (تم خدائے رحمان کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں پاؤ گے، اب پھر سے نظر دوڑا کر دیکھو کیا تمہیں کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟)، ''لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ

وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ''[یٰس:۴۰] (نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے، اور نہ رات دن سے آگے نکل سکتی ہے، اور یہ سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں)۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ امت مسلمہ کی زندگی، فکر اور رویہ اِس تکوینی توازن کا پرتو ہو، اور اس طرح یہ امت دوسری تمام امتوں سے ممتاز ہو، امت مسلمہ کی اس نمایاں خصوصیت کا اشارہ ہمیں قرآن مجید کی اُس آیت میں ملتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ''وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً ''[بقرہ:۱۴۳] (اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے تا کہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو، اور رسول تم پر گواہ بنے)۔

امت اسلامیہ کے معتدل امت ہونے کا راز اُس منہج ونظام کے اعتدال میں پنہاں ہے جس کی وہ پیرو ہے، یہ ایک معتدل امت کا معتدل منہج ہے، یہ افراط وتفریط سے محفوظ اعتدال وتوازن کا آئینہ دار منہج ہے۔

اعتدال کی امتیازی خصوصیات اور اس کے منافع:

خدائے علیم وحکیم نے اعتدال کو اس آخری امت اور اپنے آخری نبی پر نازل کردہ اپنی آخری شریعت کا امتیازی وصف قرار دیا ہے۔

اعتدال ابدی شریعت کے شایان شان وصف ہے:

ایک محدود زمانہ کے لئے نازل ہونے والی شریعت میں اس کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ وہ ایک طرح کی انتہا پسندی کا علاج دوسری طرح کی انتہا پسندی سے کرے، مثلاً اگر حالات کی رعایت کی بابت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے تو اس کا مقابلہ ایسی شریعت میں مثالیت پسندی میں مبالغہ سے کیا جاسکتا ہے، مادیت کی بابت غلو پسندانہ رجحان ہو تو روحانیت کی بابت غلو پسندانہ رویہ سے اس کا

مقابلہ کیا جاسکتا ہے، اس کی ایک مثال مادیت کی بابت یہودیوں اور رومیوں کے یہاں پائے جانے والے رجحان کی بابت عیسائیت کا موقف ہے۔ایسی عارضی شریعت جب اپنا عارضی کردار ادا کرتے ہوئے کسی غلو کو (خواہ دوسرے غلو ہی کے ذریعہ کیوں نہیں) ختم کردے تو پھر اعتدال کی راہ اختیار کرنا لازم ہو جاتا ہے، تاکہ اب افراط وتفریط سے بچتے ہوئے دونوں رویوں کی رعایت کی جاسکے،اسلام چونکہ ایک عالمگیر وابدی دین ہے اس لئے وہ اسی معتدل راہ کا علم بردار ہے۔

مزید برآں اعتدال میں دیگر ایسی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں جو اسلامی منہج وامت مسلمہ کو امتیازی شان عطا کرتی ہیں اور اس امت کو سیادت ودوام سے بہرہ ور کرتی ہیں۔

الف: اعتدال کا مطلب عدل وانصاف:

آیت قرآنی میں اس امت کو جس صفت اعتدال سے متصف بتایا گیا ہے اور جس کے نتیجہ میں اسے منصب شہادت پر فائز قرار دیا گیا ہے اس میں عدل وانصاف کے معنیٰ بھی پنہاں ہیں، اس لئے کہ عدل شہادت کے لئے لازمی مطلوبہ صفت ہے، جو شخص عادل نہیں ہوگا اس کی گواہی نا قابل قبول ہوگی، عادل گواہ ہی لوگوں کے نزدیک مقبول ہوتا ہے۔

اس آیت میں ''وسط'' کی تفسیر ''عدل'' سے خود آں حضرت ﷺ سے منقول ہے، امام احمد اور امام بخاری نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت میں ''وسط'' کی تفسیر ''عدل'' سے کی ہے (۱)، عدل، توسط اور توازن قریب المعنیٰ الفاظ ہیں، عدل کا مطلب ہے: دو یا دو سے زائد متنازع فریقوں میں بغیر کسی کی جانب مائل ہوئے معتدل راہ اختیار کرنا، یا بالفاظ دیگر ان فریقوں کے درمیان ایسا توازن قائم کرنا کہ ان میں سے ہر ایک کو (کسی کی بے جا حمایت یا کسی پر ظلم کئے بغیر) اس کا پورا پورا حق دیا جائے، زہیر کا مدح میں شعر ہے:

هم وسط يرضى الأنام بحكمهم   اذا نزلت احدى الليالي العظائم

۱- بخاری: احادیث الانبیاء (۳۳۳۹) مسند احمد: (۱۱۲۷۱)، ترمذی: تفسیر القرآن (۲۹۶۱) بروایت حضرت ابوسعید خدری

(وہ انصاف واعتدال سے ایسے بہرہ ور ہیں کہ جب کوئی مشکل وقت آپڑتا ہے تو لوگ ان کے فیصلے کو پسند کرتے ہیں)۔

اس شعر میں اپنے ممدوحوں کو شاعر نے انصاف اور غیر جانبداری سے متصف بتایا ہے۔

آیتِ قرآنی ''قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ'' [قلم:۲۸] میں ''أوسطھم'' کے معنی مفسرین نے سب سے زیادہ انصاف ور بتائے ہیں (۱)، امام رازی نے اس تفسیر کی مزید تائید کرتے ہوئے لکھا ہے: کسی بھی چیز میں سب سے زیادہ عادل حصہ اس کا بیچ کا حصہ ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ تمام جانبوں پر یکساں اور مبنی بر اعتدال فیصلہ کرتا ہے (۲)۔

مشہور مفسر ابو سعود کہتے ہیں: اصل میں وسط اس کو کہتے ہیں جو مرکز کی حیثیت سے تمام جوانب کے تئیں یکساں ہو، پھر اس کا استعمال قابل ستائش انسانی عادات کے لئے ہونے لگا اس لئے کہ وہ افراط وتفریط کی حامل مذموم خصلتوں کے لئے ''وسط'' ہوتی ہیں (۳)۔

یعنی وسط کا مطلب ہے: عدل واعتدال یا بالفاظ دیگر: افراط وتفریط سے بچتے ہوئے توازن قائم کرنا۔

ب- اعتدال کا مطلب: صحت

اعتدال کا ایک مطلب منہج کی صحت، اور انحراف سے اجتناب بھی ہے، صحیح منہج یا قرآن کے الفاظ میں ''صراط مستقیم'' کی تشریح ایک مفسر نے یوں کی ہے: وہ سیدھا راستہ جو ادھر ادھر جانے والے راستوں کے بیچ میں واقع ہو، اگر ہم دو مقابل نقطوں کے درمیان بہت سی لکیریں فرض کریں تو سیدھی لکیر وہ ہوگی جو ٹیڑھی میڑھی لکیروں کے بیچ میں واقع ہو، اس کے

۱- ملاحظہ ہو: تفسیر طبری: ۱۲/ ۱۹۳، تفسیر ابن کثیر، ۴/ ۵۲۱، تفسیر قرطبی: ۲/ ۱۴۸

۲- ملاحظہ ہو: تفسیر رازی: ۴/ ۱۰۸، ۱۰۹، المعبعۃ المصریہ، ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۳۵

۳- تفسیر ابی السعود: ۱/ ۱۲۳، مطبوعہ صبیح

ٹیڑھے میڑھے راستوں کے بیچ میں ہونے کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس پر چلنے والی امت دیگر امتوں کی بنسبت ''امت وسط'' ہو(حوالۂ بالا)۔

اسی لئے اسلام نے مسلمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ ہر روز کم از کم سترہ مرتبہ (فرض نماز پنجگانہ میں سترہ رکعتیں ہی ہیں) اللہ تعالیٰ سے ''صراط مستقیم'' کی توفیق مانگے، یعنی اپنی نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوئے یوں عرض کرے ''اھدِنَــــا الصِّرَاطَ الْمُستَقِیمَ صِرَاطَ الَّــذِینَ أَنعَـمـتَ عَلَیهِمْ غَیرِ المَغضُوبِ عَلَیهِمْ وَلاَ الضَّالِّینَ'' [فاتحہ:۶-۷] (ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت عطا فرما، ان لوگوں کے راستے کی جن پر تونے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کے راستہ کی جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں)۔

صرف اسلام ہی ''اعتدال'' کی اس امتیازی خصوصیت کا حامل ہے، تفسیر ماثور میں ''مغضوب علیہم'' کی مثال کے طور پر یہود اور ''ضالین'' کی مثال کے طور پر نصاریٰ کا تذکرہ کیا گیا ہے (۱)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے مسائل میں یہود و نصاریٰ افراط وتفریط کے شکار رہے ہیں، یہود نے انبیا کو قتل کیا تو نصاریٰ نے نبی کو خدا بنادیا...... یہودیوں نے تحریم میں افراط کیا تو نصرانیوں نے تحلیل میں، یہاں تک کہ انہوں نے کہا: طیبین کے لئے ہر چیز طیب ہے۔ یہودیوں نے مادیت کے سلسلے میں غلو کیا، اور نصرانیوں نے اس پہلو میں کوتاہی کی ...... یہودیوں نے تعبدی امور وشعائر میں ظاہری رسوم کے اعتبار کے سلسلے میں غلو کیا تو نصاریٰ نے ان کے الغا میں غلو کیا۔

مسلمانوں کو اسلام کی ہدایت ہے کہ وہ فریقین کی انتہا پسندی سے اجتناب کریں، اس ''معتدل منہج'' یا ''صراط مستقیم'' پر کار بند رہیں جس پر وہ تمام مقبولان بارگاہ خداوندی کار بند رہے جن سے اللہ راضی ہوا، اور جن پر اس کے انعامات ہوئے، یعنی انبیاء،

۱- مسند احمد: ۲۰۳۵۱، مسند کے محققین نے لکھا ہے: اس کی سند صحیح ہے، رجال ثقہ ہیں، صحابی مجہول ہیں، لیکن اس طبقہ میں جہالت مضر نہیں ہے، مسند ابو یعلیٰ: ۱۳/ ۱۰۱، بیہقی: شعب الایمان: ۴/ ۶۱، ہیثمی: مجمع الزوائد بحوالۂ ابو یعلیٰ: ۱: ۲۰۶، ہیثمی نے سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

صدیقین، شہدا اور صالحین۔

ج: اعتدال دلیل افضلیت:

باایں ہمہ خصوصیات اعتدال مادی ومعنوی امور میں دلیل افضلیت ونشانِ امتیاز ہے، مادی امور میں دیکھیں تو لڑی میں بیچ کا دانہ سب سے بہتر ہوتا ہے، قائد قوم بیچ میں ہوتا ہے اور متعبین اسکے گردوپیش۔ معنوی امور میں بھی اعتدال ہمیشہ انتہا پسندی سے بہتر ہی ہوتا ہے۔

اسی لئے عربوں کے یہاں مشہور مقولہ ہے: "خیر الأمور الوسط" (بہترین راہ، راہِ اعتدال ہے) ارسطو کا کہنا ہے: "دو رذائل کے درمیان کی حد اعتدال ہی فضیلت ہے"، اسی وجہ سے ابن کثیر نے ارشاد خداوندی: "أمة وسطاً" [بقرہ:۱۴۳] کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے: "وسط" یہاں بہترین کے معنیٰ میں ہے، عرب کہتے ہیں "قریش أوسط العرب نسبا وداراً" یعنی قریش نسب وعلاقہ کے اعتبار سے عرب میں بہترین ہیں، اسی طرح کہا جاتا ہے: "کان رسول الله صلی الله علیه وسلم وسطا في قومه" یعنی رسول اکرم ﷺ اپنی قوم میں سب سے اچھے نسب والے تھے، اسی معنیٰ میں یہ لفظ "الصلاۃ الوسطی" میں استعمال ہوا ہے، یعنی بہترین نماز (تفسیر ابن کثیر:۱/۱۹۰)۔

د- اعتدال امن کا ضامن ہے:

اسی طرح اعتدال (وسطیت) امن اور خطرات سے حفاظت کا ضامن ہے، اس لئے کہ کسی بھی شی کے اطراف عام طور پر مصائب کی زد میں آتے ہیں جب کہ بیچ کا حصہ محفوظ رہتا ہے، شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

كانت هي الوسط المحميّ فاكتنفتْ　　بها الحوادث حتى أصبحت طرفاً

(وہ محفوظ وسطی علاقہ تھا، پھر اس کو ایسے مصائب نے آگھیرا کہ وہ کنارہ ہو گیا)

یہی حال معتدل نظام، منہج اور امت کا بھی ہے۔

ھ-اعتدال دلیل قوت ہے:

اعتدال دلیل قوت ہے، اس لئے کہ بیچ کا حصہ ہی مرکز قوت ہوتا ہے، جوانی ہی کو دیکھ لیجئے، وہ قوت کا مرحلہ ہے اور بچپن و بڑھاپے کے دوان مرحلوں کے بیچ کا مرحلہ ہے جن میں ضعف ہوتا ہے۔

و-اعتدال مرکز وحدت ہے:

اعتدال مرکز وحدت اور نقطۂ اتصال ہے، اطراف بے شمار ہوتے ہیں، لیکن ''وسط'' (درمیانی حصہ یا راہ) ایک ہی ہوتا ہے، تمام اطراف اس پر آ کر مل سکتے ہیں، اس لئے کہ یہ مرکز ہوتا ہے، مادی، فکری اور معنوی تمام پہلوؤں میں ایسا ہوتا ہے۔

دائرہ کا مرکز اس کے بیچ میں ہوتا ہے، گردو پیش سے آنے والے تمام خطوط اس کے پاس آ کر مل سکتے ہیں، اسی طرح معتدل فکر کے نقطۂ توازن واعتدال پر آ کر تمام انتہا پسند افکار مل سکتے ہیں، انتہا پسندی جب بھی پائی جائے گی فکری اختلاف وتعدد بھی یقینی طور پر پایا جائے گا، اور انتہا پسندی جس قدر شدید ہوگی اختلاف بھی اسی قدر شدید ہوگا، جب کہ اعتدال فکری وحدت کا مرکز وسرچشمہ ہے، یہی وجہ ہے کہ انتہا پسندانہ افکار ونظریات ایک ہی امت کے فرزندوں کے درمیان جیسا اختلاف وافتراق پیدا کرتے ہیں عام طور پر معتدل مذاہب نہیں کرتے ہیں۔

اعتدال کے انہی امتیازات ومنافع کی وجہ سے اسلام نے اسے اپنی ایک عام خصوصیت بنایا ہے، جو اس کے تمام مشتملات میں جلوہ گر نظر آتی ہے، اگلے صفحات سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

اسلام میں اعتدال کے مظاہر

چونکہ اعتدال اِن خوبیوں کا حامل ہے اس لئے وہ اسلام کے تمام پہلوؤں (نظریہ، عمل، تربیت وتشریع) میں جلوہ گر ہے، عقیدہ، عبادت، اخلاق وآداب، اور تشریع ونظام میں اسلام اسی راہ اعتدال پر گامزن ہے۔

اوّل: عقائد میں:

۱- عقائد کے سلسلے میں اسلام راہِ اعتدال پر گامزن ہے، وہ ان کمزور اعتقادوں کی روش سے بھی محفوظ ہے جو ہر چیز پر ایمان لے آتے ہیں اور بلا دلیل سب کچھ مان لیتے ہیں، اور ان مادہ پرستوں کے طرز سے بھی اجتناب برتتا ہے، جو تمام مافوق الفطرت امور کے انکاری ہیں اور فطرت، عقل ومعجزہ کی آواز پر کان نہیں دھرتے ہیں۔

اسلام ایمان واعتقاد کا داعی ہے، لیکن ان چیزوں پر اعتقاد وایمان کا جن کی بابت قطعی ویقینی دلیل پائی جائے، اور جن چیزوں کے حق میں قطعی ویقینی دلائل نہ ہوں اسلام انہیں اوہام میں شمار کرتا ہے، اس کا دائمی مطالبہ ہے: ''قُلْ هَاتُواْ بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ'' [بقرہ:۱۱۱] (کہہ دیجئے کہ اپنے دلائل پیش کرو اگر تم سچے ہو)۔

۲- ایک جانب وہ دہریے ہیں جو کسی بھی خدا پر ایمان نہیں لاتے ہیں، اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے بے شمار معبود بنا رکھے ہیں، یہاں تک کہ گایوں اور پتھروں کو بھی پوجتے ہیں، اسلام ان دونوں کے درمیان کی راہ اعتدال پر گامزن ہے۔

وہ اس خدائے وحدہ لاشریک لہ پر ایمان کی دعوت دیتا ہے جو نہ کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ اس نے کسی کو جنا ہے، اور نہ ہی اس کا کوئی ہم سر ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اس کی مخلوق

ہے، جو نہ نفع وضرر کی مالک ہے اور نہ کسی کو موت وزندگی دے سکتی ہے، لہٰذا اس کے علاوہ کسی اور کو معبود ماننا شرک اور واضح گمراہی ہے: ''وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُو مِن دُونِ اللَّهِ مَن لَّا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَن دُعَائِهِمْ غَافِلُون'' [احقاف:۵] (آخر اس شخص سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ایسوں کو پکارے جو قیامت تک جواب نہیں دے سکتے، اور جو ان کی دعاؤں سے بے خبر ہیں)۔

۳- اسی طرح کچھ لوگ اس کائنات کو ہی حق مانتے ہیں، اور اس کے علاوہ کی نہ نظر آنے والی ہر چیز کو خرافات واوہام کے قبیل سے مانتے ہیں، یہ مادہ پرست ہیں جو ہر مافوق الفطرت چیز کے وجود کے انکاری ہیں، کچھ اور لوگ کائنات کو ایک وہم اور خیالی دنیا مانتے ہیں، ان کے نزدیک صرف اللہ کا ہی وجود ہے، اس کا غیر موجود ہی نہیں ہے، یہ وحدت الوجود کے قائلین ہیں۔

اسلام کائنات کو ایک حقیقی وجود مانتا ہے، لیکن وہ اس حقیقت سے آگے بڑھ کر عظیم تر حقیقت یعنی اس اللہ کی ذات پر بھی عقیدہ کا داعی ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا اور جو اس کو چلاتا ہے: ''إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُوْلِي الألْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّهَ قِيَاماً وَقُعُوداً وَعَلَىَ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذا بَاطِلاً'' [آل عمران:۱۹۰-۱۹۱] (زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں، اور آسمان وزمین کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں، [وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں] ''پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے)۔

۴- کچھ لوگ انسان کو خدا قرار دیتے ہیں، اسے ربوبیت کی صفات سے متصف بتاتے ہیں، اسے خود اپنا خدا مانتے ہیں کہ وہ جو چاہے کرے، دوسری طرف کچھ لوگ انسان کو سماجی یا دینی جبر کا اسیر مانتے ہیں، ان کے نزدیک انسان کی مثال آندھی میں اڑتے تنکے کی سی

ہے، یا اس پتلی کی سی ہے جو معاشرہ، معیشت یا تقدیر کے اشاروں پر ناچا کرتی ہے۔

لیکن اسلام ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے درمیان کی راہ اعتدال پر چلتے ہوئے انسان کو ایک ذمہ دار مکلّف مخلوق مانتا ہے، اسلام کی نگاہ میں انسان کائنات میں اشرف ترین ہے لیکن اللہ کا بندہ ہے، اپنے آپ کو تبدیل کر کے اپنے گردوپیش کو تبدیل کر سکتا ہے: ''إِنَّ اللّٰهَ لاَ يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُواْ مَا بِأَنْفُسِهِمْ'' [رعد:١١] (اللہ اس وقت تک کسی قوم کے حالات نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی صفات اور اپنے اعمال میں تبدیلی نہ لاتے)۔

۵- کچھ لوگ انبیا کی تقدیس میں مبالغہ کر کے انہیں خدا یا خدا کا بیٹا قرار دے دیتے ہیں، کچھ لوگ انبیا کی تکذیب کرتے ہیں، ان پر الزامات لگاتے ہیں اور انہیں طرح طرح سے ستاتے ہیں۔

لیکن اسلام ہمیں اس سلسلے میں راہ اعتدال کی راہ نمائی کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ انبیاء ہمارے مثل انسان ہیں، کھانا کھاتے ہیں، بازاروں میں جاتے ہیں، ان میں سے بہت سوں کی بیویاں اور اولاد ہیں، دیگر انسانوں سے ان میں بس یہ فرق ہوتا ہے کہ اللہ ان پر وحی نازل کرتا ہے اور معجزات سے ان کی تائید کرتا ہے: ''قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِن نَّحْنُ إِلاَّ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَـكِنَّ اللّهَ يَمُنُّ عَلَى مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَمَا كَانَ لَنَا أَن نَّأْتِيَكُم بِسُلْطَانٍ إِلاَّ بِإِذْنِ اللّهِ وَعلَى اللّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ'' [ابراہیم:١١] (ان سے ان کے رسولوں نے کہا: ہم تمہارے ہی جیسے انسان ہیں، لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے، ہم اللہ کے حکم کے بغیر تمہیں کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتے، اور اللہ پر ہی مومنوں کو بھروسہ کرنا چاہئے)۔

۶- کچھ لوگ صرف عقل کو ہی معرفت حقائق کا مصدر مانتے ہیں، جب کہ کچھ لوگ صرف وحی والہام کو یہ مقام دیتے ہیں، اس سلسلے میں عقل کے کسی طرح مثبت ومنفی کردار کے قائل نہیں ہوتے ہیں۔

اسلام ان دونوں کے درمیان کے معتدل نقطۂ نظر کو اختیار کرتے ہوئے عقل کو تسلیم

کرتا ہے، اسے غور وفکر کی دعوت دیتا ہے، اس کے لئے جمود و کورانہ تقلید کو ممنوع قرار دیتا ہے اسے اوامر ونواہی کا مخاطب بناتا ہے، نیز ان کے فہم واستنباط کا عقل کو مکلّف بناتا ہے، بلکہ کائنات کی دو عظیم ترین حقیقتوں (۱- وجود خدائے تعالیٰ ، ۲- دعوائے نبوت کی سچائی) کے اثبات میں ان پر اعتماد کرتا ہے، لیکن وہ وحی کو عقل کا مکمّل اوران میدانوں میں اس کا معاون مانتا ہے جہاں عقل کا کچھ کام نہیں ہوتا ہے، جو میدان عقل کی استطاعت سے خارج ہوتے ہیں (جیسے غیبی اور اللہ کی عبادت کے طریقے) وہاں اسلام وحی کو عقل کا راہ نما مانتا ہے۔

دوم- عبادات وشعائر میں:

دنیا میں کچھ مذاہب ایسے ہیں جنہوں نے روحانی پہلو (عبادت وغیرہ) پر بالکل بھی توجہ نہیں دی ہے، مثلاً بدھزم نے اپنے تمام فرائض صرف اخلاقی پہلو تک محدود رکھے ہیں جب کہ کچھ اور مذاہب کا اپنے متبعین سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ کاروبار زندگی سے بالکل منھ موڑ کر اپنے آپ کو صرف اور صرف عبادت کے لئے خاص کرلیں، جیسے عیسائی رہبانیت۔

لیکن اسلام اس سلسلے میں بھی راہ اعتدال پر گامزن ہے، اس نے مسلمانوں کے لئے کچھ عبادتیں روزانہ کے لئے فرض کی ہیں، جیسے نمازیں، کچھ عبادتیں سال میں ایک مرتبہ کے لئے فرض کی ہیں جیسے روزہ، اور کچھ عبادتیں عمر بھر میں ایک مرتبہ ادا کرنے کے لئے فرض کی ہیں، جیسے حج، تاکہ انسان کا تعلق اللہ سے ہمیشہ قائم رہے، اور پھر وہ اللہ کی زمین پر چل پھر کر کاروبار زندگی میں لگا رہے اور اللہ کا رزق حاصل کرتا رہے۔

سطور بالا میں جو کچھ لکھا گیا اس کی سب سے واضح دلیل غالباً سورۂ جمعہ کی یہ آیات ہیں: ’’ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ

تُفْلِحُونَ ''[جمعہ:۹-۱۰](اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن تمہیں نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی جانب فوراً آؤ، اور خرید وفروخت بند کردو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو، پھر جب نماز ختم ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ، اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو یاد کرو تاکہ تم فلاح یاب ہوجاؤ۔)

دین ودنیا کے تئیں یہ مسلمان کا رویہ ہے، جمعہ کے دن میں بھی نماز سے پہلے کاروبار زندگی میں مشغولیت، پھر اللہ کے ذکر اور نماز کے لئے مسجد جانا، خرید وفروخت، اور دیگر دنیاوی مشغلوں کو چھوڑ دینا، پھر نماز کے ختم ہوجانے کے بعد زمین میں پھیل جانا، حصول رزق کی جدوجہد کرنا، کسی بھی حال میں اللہ کی یاد سے غافل نہ رہنا، کہ یہ فلاح وکامرانی کی اساس ہے۔

سوم- اخلاق میں:

کچھ لوگوں نے انسان کو فرشتہ یا فرشتہ نما مخلوق سمجھ کر اس کے لئے ایسے اقدار وضع کئے ہیں جن کی وہ استطاعت نہیں رکھتا ہے، دوسری طرف کچھ لوگ انسان کو جانور یا جانور جیسا تصور کرتے ہیں، ایسے لوگوں نے انسان کے لئے وہ اخلاقیات وضع کی ہیں جو اس کی شان سے کم تر ہیں، اوّل الذکر گروہ نے انسانوں کے لئے ضرورت سے زیادہ حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے فطرت انسانی کو خیر محض تصور کیا، جب کہ دوسروں نے اسے سراپا شر جانا، اسلام افراط وتفریط کے ان رویوں کے درمیان کی راہ اعتدال پر گامزن ہے۔

اسلام کی نظر میں انسان مخلوق مرکب ہے، اس میں عقل بھی ہے اور خواہشات بھی، حیوانی پہلو بھی ہے اور فرشتوں کی روحانیت بھی، اس کی فطرت میں نیکی وبدی دونوں کے راستوں پر چلنے کی استطاعت رکھی گئی ہے، اس میں جس قدر تقوے کی استعداد ہے اسی قدر فسق وفجور کی بھی، اس کی ذمہ داری اپنے نفس سے جہاد کرکے اس کا تزکیہ کرنا ہے: ''وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا ''[شمس:۷-۱۰]

(قسم ہے نفس انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اسے ہموار کیا، پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کردی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو خراب کردیا)۔

۲- کچھ مذاہب انسان کو ایک ایسی بلند روحانی مخلوق تصور کرتے ہیں جسے زمینی جسم میں قید کردیا گیا ہے، ان کے نزدیک اس روح کی پاکیزگی کے لئے اس جسم کو ستانا اور عیش وعشرت سے محروم رکھنا ضروری ہے، یہ نقطۂ نظر ہندومت جیسے کچھ مذاہب کا ہے، جب کہ بعض دیگر مادی مذاہب انسان کو صرف ایک ایسا مادی وجود مانتے ہیں جس میں کوئی روح نہیں پائی جاتی ہے۔

لیکن اسلام کی نظر میں انسان ایک روحانی و مادی وجود ہے، ابوالبشر حضرت آدمؑ کی تخلیق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، اللہ نے ان کو مٹی سے پیدا کیا، اس سے انسانی بدن کے مادی پہلو کا علم ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس جسم میں ایک دوسری چیز ڈالی، یہ دوسری چیز ہی انسان کے امتیاز کا راز اور اس کی بلند مقامی کا سبب ہے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا تھا: ’’فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُواْ لَهُ سَاجِدِينَ‘‘ [حجر:۲۹] (اور جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا)۔

انسان چونکہ روح و بدن کا مرکب ہے اس لئے اس کی روح اور اس کے بدن دونوں کا اس پر حق ہے، اور دونوں کے حقوق کی ادائیگی اس پر لازم ہے۔

۳- کچھ لوگ حیات اخروی کے منکر ہیں، اور اسی دنیوی زندگی کو ہی سب کچھ خیال کرتے ہیں، ’’وَقَالُواْ إِنْ هِيَ إِلاَّ حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ‘‘ [انعام:۲۹] (اور انہوں نے کہا بس ہماری دنیوی زندگی ہی ہے، اور ہمیں موت کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا)، اپنے اس نقطۂ نظر کی وجہ سے یہ لوگ خواہشاتِ نفسانی کے اسیر ہو گئے ہیں، مادی اشیاء کے غلام ہیں، اور دنیا کے انفرادی منافع سے ماوراء اپنے کسی ہدف سے ناآشنا ہیں، ہر زمانہ

وعلاقہ کے مادہ پرستوں کا یہی حال ہے، دوسری جانب کچھ لوگ اس دنیوی زندگی کو بالکل ناقابل توجہ کہتے ہیں، اسے ایسا شر سمجھتے ہیں جس کا مقابلہ لازمی اور جس سے اجتناب فرض ہے، ان لوگوں نے دنیا کی نعمتوں کو اپنے لئے حرام قرار دے لیا ہے، اپنے اہل وعیال سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے اور کاروبار زندگی سے بالکل بے تعلق ہو گئے ہیں۔

اسلام افراط وتفریط میں مبتلا ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے اجتناب کرتے ہوئے دونوں زندگیوں کا خیال رکھتا ہے، دنیا کو آخرت کی کھیتی مانتا ہے، تعمیر دنیا کو عبادت خداوندی اور خلافت ارضی کی ذمہ داری کی ادائیگی مانتا ہے، غلو پسند دین داروں کے ذریعہ زینت وطیبات کی حرمت پر بھی نکیر کرتا ہے اور شہوتوں وفضول خرچیوں میں دوسرے فریق کے انہماک پر بھی تنقید کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’’وَالَّذِيْنَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُم‘‘ [محمد:۱۲] (جن لوگوں نے کفر کیا وہ عارضی مزے اڑاتے ہیں اور جانوروں کی طرح کھاتے ہیں، اور جہنم ان کا ٹھکانہ ہے)، ایک اور جگہ پر ارشاد ہوا ہے: ’’يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلاَ تُسْرِفُوا إِنَّهُ لاَيُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ‘‘ [اعراف: ۳۱-۳۲] (اے آدم کی اولاد ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کیا کرو، اور کھاؤ پیو، اور فضول خرچی نہ کرو، بلا شبہ اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے، پوچھئے کہ اللہ نے جو زینت اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہے اس کو اور پاکیزہ رزق کو کس نے حرام کیا ہے)، قرآن کہتا ہے کہ اچھی اور خوش بختانہ دنیوی زندگی مومن بندوں کے لئے اللہ کی جانب سے انعام ہے: ’’فَآتَاهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الآخِرَةِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ‘‘ [آل عمران:۱۴۸] (تو اللہ نے ان کو دنیا کا انعام اور آخرت کا بہترین انعام دیا، اور اللہ نیکوکاروں کو پسند فرماتا ہے)، قرآن نے اہل ایمان کو دنیا وآخرت کی بہتری کی جامع یہ دعا تعلیم فرمائی ہے: ’’رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ‘‘ [بقرہ:۲۰۱] (اے ہمارے رب، ہمیں دنیا

میں بہتری دے، اور آخرت میں بہتری دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا)، اسی طرح رسول اکرمؐ کی ایک دعا ہے: ''اللهم اصلح لی دینی الذي هو عصمة أمری، واصلح لی دنیا ی التي فیها معاشي واصلح لی آخر تی التي فیها معادی، واجعل الحیاة زیادة لی في کل خیر، والموت راحة لی من کل شر''(۱)، (اے اللہ! میرا دین درست فرمادے جس سے میرا سب کچھ ہے، اور میری دنیا درست فرمادے جس میں میری زندگی کا سامان ہے، اور میری آخرت درست فرمادے جہاں مجھے واپس جانا اور ہمیشہ رہنا ہے، اور میری زندگی کو ہر بھلائی میں ترقی کا ذریعہ بنا، اور موت کو ہر برائی سے نجات کا ذریعہ بنا)۔

چہارم۔تشریع میں:

اپنے احکام اور قانونی وسماجی نظام میں بھی اسلام راہ اعتدال پر گامزن ہے، وہ نہ اس یہودیت کی طرح سے تحریم میں مبالغہ کرتا ہے جس میں حرام اشیاء وافعال کی کثرت ہے، خود حضرت یعقوب نے کچھ چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا، اور اللہ نے بھی یہودیوں کی حرکتوں کی پاداش میں ان پر بہت سی چیزیں حرام قرار دے دی تھیں، قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: ''فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُواْ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَن سَبِيلِ اللّهِ كَثِيراً وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُواْ عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ'' [نساء:۱۶۰-۱۶۱] (یہودیوں کی حرکتوں کی وجہ سے اور ان کے ذریعہ اللہ کے راستہ سے بکثرت روکے جانے کی وجہ سے، اور باوجود سود سے روکے جانے کے سود لینے کی وجہ سے اور لوگوں کا مال غلط طریقے سے غصب کرنے کی وجہ سے ہم نے ان پر ایسی بہت سی پاکیزہ چیزیں حرام کردی تھیں جو ان کے لئے حلال کی گئی تھیں)۔

اسی طرح اسلام مسیحیت کی طرح اباحت میں بھی افراط نہیں کرتا ہے، مسیحیت کا حال تو یہ ہے کہ تورات میں جن چیزوں کو واضح طور پر حرام قرار دیا گیا تھا اس نے ان چیزوں کو حلال

۱- مسلم، الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، ۲۷۲۰، بروایت حضرت ابوہریرہؓ۔

کر دیا، حالانکہ انجیل کا بیان ہے کہ مسیح تورات کی شریعت کو ختم کرنے کے لئے نہیں اس کی شریعت کی تکمیل کے لئے آئے تھے (انجیل متی: ۱۷/۵) اس کے باوجود مسیحوں کا کہنا ہے کہ "پاک لوگوں کے لئے سب چیزیں پاک ہیں" (ططس کے نام پولس کا خط: ۱۵/۱)۔

اسلام نے تحلیل وتحریم کی ہے، لیکن تحلیل کو صرف اللہ کا حق مانا ہے، انسانوں کا نہیں، اس نے گندی اور ضرر رساں چیزوں کو حرام اور پاکیزہ ومفید چیزوں کو جائز قرار دیا ہے، اسی لئے اہل کتاب کے نزدیک رسول کے اوصاف یہ تھے کہ: "يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ" [اعراف: ۱۵۷] (وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے، اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے)۔

اسلامی شریعت اپنے تمام پہلوؤں کی طرح عائلی احکام کے سلسلے میں بھی معتدل ہے، وہ نہ کچھ لوگوں کی طرح بلا قیود وحدود تعدد ازدواج کی اجازت دیتی ہے، اور نہ ہی کچھ دیگر لوگوں کی طرح تعدد ازدواج کو سرے سے غلط قرار دیتی ہے خواہ کیسی ہی حاجت، ضرورت یا مصلحت اس کا تقاضہ کرے۔

تعدد ازدواج کی اجازت اسلام نے دی تو ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ تمام بیویوں کے حقوق کی ادائیگی کی صلاحیت رکھتا ہو، اور ان کے درمیان انصاف پر قادر ہو، اگر انصاف نہ کر سکنے کا خدشہ ہو تو پھر انسان کو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا لازمی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً" [نساء: ۳] (اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو)۔

طلاق کے سلسلے میں بھی وہ راہ اعتدال پر گامزن ہے، وہ نہ کیتھولکس کی طرح اس بات کا قائل ہے کہ خواہ ازدواجی زندگی کیسی ہی جہنم کیوں نہ بن جائے طلاق حرام ہے، نہ

آرتھوڈوکس کی طرح اس کا یہ کہنا ہے کہ سوائے زنا اور ازدواجی خیانت کے کسی بھی صورت میں طلاق کی اجازت نہیں ہے، اور نہ ہی وہ ان لوگوں کی مانند ہے جنہوں نے طلاق کی اجازت بلا قید و شرط دے رکھی ہے، جن کے نزدیک کمزور ترین سبب کی بنا پر بھی طلاق دی جاسکتی ہے، اور جن کے نزدیک یہ مضبوط معاہدہ تارِ عنکبوت سے بھی کمزور ہے۔

اسلام نے طلاق کو اس صورت کے لئے مشروع کیا ہے جب علاج کے دیگر تمام وسائل ناکام ہو جائیں اور اصلاح و پنچایت کی کوئی کوشش کارگر نہ ہو، لیکن ایسی صورت میں بھی طلاق اللہ کے نزدیک مبغوض ترین حلال ہے، اور ایک ایک مرتبہ طلاق دینے والا شخص اس بات کی اجازت رکھتا ہے کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی کو رجوع کر کے دوبارہ رشتۂ ازدواج میں لے آئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ "[بقرہ:۲۲۹] (طلاق دوبار ہے، پھر یا تو صحیح طریقے سے عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے)۔

اسلام اپنے سماجی نظام و قانون میں بھی معتدل ہے، وہ نہ سرمایہ داروں کی طرح معاشرہ کو نقصان پہنچا کر فرد کا خیال رکھتا ہے، یعنی نہ اسے بہت زیادہ حقوق دے کر اس پر بہت کم ذمہ داریاں ڈالتا ہے، کہ اسے بس اپنے حقوق یاد رہیں، اپنی ذمہ داریاں یاد ہی نہ آئیں، اور نہ اسلام کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی طرح فرد سے صرف نظر کر کے معاشرہ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہوئے فرد کو بہت کم حقوق دیتا اس کی آزادیوں پر قدغن لگاتا اور اس کی ذاتی خواہشات کا گلا گھونٹتا ہے۔

فرد و معاشرہ کے تقاضوں کے درمیان توازن:

فرد و معاشرہ کے تقاضوں کی رعایت کے سلسلے میں اسلامی نظام زبردست توازن کا حامل ہے، اس نظام میں فرد کی آزادی اور معاشرہ کی مصلحت کے درمیان زبردست توازن پایا جاتا ہے،

حقوق وواجبات یکساں ہوتے ہیں، منافع اور ذمہ داریوں کی تقسیم انصاف کے ساتھ کی جاتی ہے۔

فرد و معاشرہ کے درمیان تعلق کے سلسلے میں مذاہب اور فلاسفہ ہمیشہ پریشان رہے ہیں، کیا فرد اصل ہے اور معاشرہ اس پر مبنی؟ اس لئے کہ معاشرہ افراد سے ہی تشکیل پاتا ہے، یا معاشرہ اصل ہے اور فرد اس کا نتیجہ؟ اس لئے کہ معاشرہ کے بغیر فرد خام مال ہے، معاشرہ ہی اس خام مال کو شکل وصورت دیتا ہے، اس لئے کہ معاشرہ ہی فرد کو تہذیب، عادات واطوار سے بہرہ ور کرتا ہے۔

کچھ لوگ فرد کو اصل واساس مانتے ہیں اور کچھ لوگ معاشرہ کو، اس مسئلہ کی بابت فلاسفہ، قانون سازوں، ماہرین سماجیات، معاشیات وسیاسیات کے درمیان زبردست اختلاف پایا جاتا ہے، یہ لوگ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ پائے ہیں۔

ارسطو انسان کی ''فردیت'' کا قائل تھا، اور ''فردیت'' پر قائم نظام کو اچھا مانتا تھا، جب کہ اس کا استاذ افلاطون Callectivism کی جانب رجحان رکھتا تھا، اس کی کتاب The republic سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔

یعنی مشہور ترین قدیم انسانی فلسفہ یونانی فلسفہ بھی اس عقدہ کو حل کر کے لوگوں کو کسی نتیجہ تک نہیں پہنچا سکا، تمام اہم مسائل کی بابت فلسفہ کا یہی حال ہے، وہ متضاد آرا پیش کرتا ہے، اس کے عظیم علما بھی کسی ایک حقیقت پر اتفاق نہیں کر سکتے ہیں، اسی لئے ایک عظیم فلسفی کا قول ہے: فلسفہ کی کوئی حتمی رائے نہیں ہوتی، اس لئے کہ وہ متضاد باتیں کرتا ہے۔

ایران میں اس سلسلہ میں دو متضاد نظریات سامنے آئے، ایک نظریہ خالص ''فردیت'' کا علم بردار اور زہد وتقشّف کا داعی تھا، وہ لوگوں کو شادی سے روکتا تھا، تاکہ شر والم کا مجموعہ یہ عالم جلد ہی فنا کے انجام کو پہنچ جائے، یہ مانی کا نظریہ (Manichaeism) تھا، اور ''فردیت'' کا آخری درجہ تھا، اس کے بالمقابل دوسرا نظریہ اجتماعیت کی آخری حدود پر تھا، یہ مزدک کا نظریہ تھا، اس کی دعوت مال وخواتین کی ملکیت عام کرنے کی تھی، بہت سے اوباش لوگوں نے اس کا ساتھ دیا، یہاں تک کہ یہ نظریہ مختلف علاقوں میں پھیل گیا۔

پھر آسمانی مذاہب نے زندگی میں توازن اور انسانوں کے درمیان انصاف قائم کیا، قرآن مجید میں ہے: "لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" [حدید:۲۵] (ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی، تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں)، لیکن ان آسمانی مذاہب کے متبعین نے جلد ہی اللہ کے کلمات میں تحریف کر دی جس کی وجہ سے یہ مذاہب انسانی زندگی کی بابت اپنے کردار سے بڑی حد تک محروم ہو گئے، اس لئے کہ انہوں نے اپنی اہم ترین خصوصیت "خداوندی سرچشمہ" کو ختم کر کے اپنے پیشواؤں کو بلا اجازت خداوندی تحریم و تحلیل کا حق دے دیا تھا، "اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ" [توبہ:۳۱] (ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اور مریم کے بیٹے کو رب بنالیا ہے، حالانکہ انہیں صرف ایک اکیلے اللہ ہی کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ان کے شرک سے اللہ پاک ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے کے آسمانی ادیان نے اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں پیش کیا ہے، پوری دنیا میں پھیل جانے والے یہودی غرور اور دیگر معاشروں سے بے تعلق رہنے کی اپنی روش اور اپنے نظریات کے ذریعہ "فردیت" بلکہ "ظالمانہ فردیت" کے علم بردار ہیں، قرآن ان کے جرائم گناتے ہوئے فرماتا ہے: "وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ" [نساء:۱۶۱] (انہیں سود سے روکے جانے کے باوجود ان کا سود لینا اور لوگوں کا مال غلط طریقے سے غصب کرنا)۔

پھر مسیحیت آئی تو اس نے بھی سب سے زیادہ توجہ فرد کی نجات پر دی، اور معاشرہ کو قیصر کے ہاتھ میں رہنے دیا، یا کم از کم (۱) ایسا انجیل کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت

۱- ملاحظہ ہو: ڈاکٹر سلجوقی کا محاضرہ: "وکذلک جعلنا کم أمۃ وسطا"۔

مسیح نے کہا تھا: ''جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے کو ادا کرو''(۱)۔

ماضی کے بعد ہم عصر حاضر پر نظر ڈالتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں؟

آج کی دنیا میں ''فردنوازی'' اور ''معاشرہ نوازی'' کے درمیان زبردست معرکہ بپا ہے، سرمایہ داری فرد کو عظیم ٹھہراتی ہے، اسے بنیادی محور مانتی ہے، بے شمار حقوق دیتی ہے، اس کی رو سے فرد کو ملکیت، قول، تصرف اور مزے اڑانے کی آزادی ہے، اس آزادی کو استعمال کرتے ہوئے وہ ذخیرہ اندوزی، حیلوں اور سود کے ذریعہ مال کا مالک بن سکتا ہے، پھر اپنے مال کو فقرا و مساکین پر خرچ نہ کرکے لہو ولعب، شراب اور فسق و فجور میں خرچ کرسکتا ہے، کوئی اسے روک نہیں سکتا اس لئے کہ وہ آزاد ہے۔

اشتراکی نظریے (بالخصوص مارکسزم جیسے انتہا پسند اشتراکی نظریے) فرد کی حیثیت اور اس کے حقوق بہت کم مانتے ہیں، اس کی ذمہ داریاں بہت بتاتے ہیں، ان کے نزدیک معاشرہ ہی اصل ہدف ہے، افراد بس معاشرہ کے اجزا و پرزے ہیں، معاشرہ ہی درحقیقت ریاست ہے، اور ریاست حاکم ہے، یا بالفاظ دیگر ریاست حکمراں جماعت کا ایوان بالا ہے، بلکہ وہ صرف حکمراں جماعت کا سربراہ یعنی ڈکٹیٹر ہے۔

فرد صرف چند معمولی اشیا کا مالک ہوسکتا ہے، اسے احتجاج کا یا اپنے ملک کی سیاست کی بابت رائے زنی کا حق حاصل نہیں ہے، اگر اس نے علانیہ یا خفیہ تنقید کی تو پھر اس کا انجام قید خانہ، جلاوطنی یا پھانسی کا پھندا ہے۔

یہ انسانوں کے بنائے ہوئے فلسفوں اور نظریات یا انسانوں کے تحریف کردہ مذاہب کا حال اور فرد و معاشرہ کی بابت ان کے نظریات ہیں، اسلام کا موقف بے نظیر، متوازن اور افراط و تفریط سے پاک ہے۔

اسلام کا شارع انسان کا خالق ہے، ایسے خالق کے بنائے ہوئے احکام اور اس کا

۱- متی: ۲۲/۲۱، لوقا: ۲۰/۲۵۔

تشکیل کردہ نظام فطرت انسان سے متصادم و معارض نہیں ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں فردیت واجتماعیت دونوں کے پہلو رکھے ہیں، فردیت اس کی ساخت کا اصل جز ہے، اسی لئے وہ اپنی ذات سے محبت کرتا ہے، اس کی ترقی کا خواہاں ہوتا ہے اور اپنے ذاتی معاملات کو آزاد و مستقل رکھنا چاہتا ہے۔

اسی کے ساتھ ہم اس کی فطرت کے اندر اجتماعی رجحان بھی دیکھتے ہیں، اسی لئے قید تنہائی انسان کے لئے سخت ترین سزا ہوتی ہے، خواہ اسے اس قید میں کیسی ہی لذیذ اشیائے خورد ونوش کیوں نہ مہیا ہوں، اسی لئے قدیم زمانہ سے حکما کا کہنا ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے، اور جدید ماہرین سماجیات کہتے ہیں: انسان ایک اجتماعیت پسند جانور ہے۔

مکمل صالح نظام وہ ہے جو انسانی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں (فردیت واجتماعیت) کا خیال رکھے اور کسی ایک پہلو کو دوسرے پہلو پر غالب نہ آنے دے، یہی وجہ ہے کہ دین فطرت اسلام ایک منصفانہ معتدل نظام لے کر آیا، جو معاشرہ کی خاطر فرد کی اور فرد کی خاطر معاشرہ کی حق تلفی نہیں کرتا ہے، نہ ہی بے حد حقوق دے کر فرد کو بگاڑتا ہے اور نہ ہی اسے ذمہ داری کے بوجھ تلے دباتا ہے، وہ فرد پر اتنی ہی ذمہ داریاں عائد کرتا ہے جتنی اس کی استطاعت میں ہوتی ہیں، اسے حرج ومشقت میں مبتلا نہیں کرتا ہے، اس کی ذمہ داریوں کے بقدر اسے حقوق بھی دیتا ہے، تاکہ اس کی ضروریات کی تکمیل ہو، اس کی عزت نفس اور اس کی انسانی عظمت محفوظ رہے۔

اس توازن واعتدال کی بہت سی مثالیں ہیں، فرد کی زندگی میں بھی، خاندان کی زندگی میں بھی، معاشرہ کی زندگی میں بھی، امت کی زندگی میں بھی، ریاست کے حوالہ سے بھی اور بین الاقوامی وانسانی تعلقات کے سلسلے میں بھی۔ ان سب کے تذکرہ کی بھی یہاں گنجائش نہیں ہے، ان کے متعلقہ مظنوں میں ان مثالوں کو ڈھونڈیں (۱)۔

☆☆☆

۱- ملاحظہ ہو: ہماری کتاب: "الخصائص العامۃ للاسلام" فصل: الوسطیۃ، ص: ۱۲۵۔

”اعتدال“ سے میرا تعلق

دو چار برس کی بات نہیں..........

اللہ کا احسان ہے کہ اس نے شروع ہی سے مجھے منہج اعتدال اختیار کرنے کی توفیق دی، میرا یہ رویہ نہ کسی کی تقلید میں تھا اور نہ خواہش نفس کی پیروی میں، بلکہ قطعی ویقینی دلائل کی روشنی میں میں اس نتیجہ تک پہنچا تھا کہ یہ منہج ہی حقیقی اسلام کی تعبیر ہے، یعنی اس اصلی اسلام کی تعبیر جو اس وقت پایا جاتا تھا جب اسلام میں فرقوں، علاقوں، نظریات ومسالک کی تقسیم وخارجی اشیا کی آمیزش نہیں ہوئی تھی، وہ صاف آئینہ کی مانند تھا، امت کے اندر پیدا ہونے والے اختلافات، حلقہ بگوش اسلام ہونے والی قوموں کے نظریات وخارجی تہذیبوں نے اس کو آلودہ نہیں کیا تھا۔

اس ”اصلی اسلام“ سے میری مراد قرآن وحدیث کا وہ اسلام ہے جس کی دعوت رسول اکرمؐ نے وحی ربانی کی روشنی میں دی تھی، اور جس کی تشریح اپنے قول وفعل سے کی تھی، یہ ان صحابہ کا اسلام تھا جنہوں نے درسگاہ نبوت میں تعلیم حاصل کی تھی، اسبابِ نزولِ قرآن وورودِ احادیث کا بچشمِ خود معاینہ کیا تھا، ان کی فطرت سلیم تھی، ایمان سچا تھا، وہ زبان کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اس لئے اس دین کا بہترین فہم حاصل کر سکتے تھے جس دین کو انہوں نے اس کے اولین معلم سے حاصل کر کے اپنی زندگیوں میں عملی طور پر برتا تھا۔

یہ وہ صحابہ ہیں جن کی تعریف اللہ نے سورۂ انفال کے آخر میں اور سورہ الفتح کے آغاز وآخر میں کی ہے، اور جن کی بابت سورۂ توبہ میں فرمایا تھا: ”وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ

الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ'' [توبہ ۱۰۰] (وہ مہاجرین وانصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہا، نیز وہ جو ان کے پیچھے راستبازی کے ساتھ آئے، اللہ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے)۔

متعدد مشہور احادیث میں رسول اکرم ﷺ نے ان کی ستائش کی ہے، مثلاً ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے: ''خير القرون قرني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم ''(۱) (سب سے بہتر لوگ میرے عہد کے لوگ ہیں، پھر ان کے بعد کے اور پھر ان کے بعد کے)۔

یہ اضافوں اور بدعتوں سے محفوظ وہ اسلام ہے جس کے ذریعہ اللہ نے امت پر نعمت کی تکمیل کی ہے، اور جس کے مکمل کرنے کا ذکر اللہ نے بطور احسان یوں کیا ہے: ''الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا'' [مائدہ: ۳] (آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے، اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی ہے، اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کیا ہے)۔

اس منہج کو مجھے اختیار کئے ہوئے نصف صدی سے زائد کا عرصہ ہو گیا ہے، اس سلسلہ کی میری پہلی کتاب غالباً ''الحلال والحرام في الإسلام'' تھی، جس کے پہلے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۶۰ء) کے مقدمہ میں یہ منہج واضح طور پر سامنے آیا تھا، میں نے اس مقدمہ میں لکھا تھا: ''میرے نزدیک اس عہد میں اسلامی موضوعات پر لکھنے اور بولنے والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک گروہ وہ ہے جس کی نگاہوں کو مغربی تہذیب کی چکا چوند نے خیرہ کر دیا ہے، عہد نو کے اس عظیم ترین بت سے وہ اتنے مرعوب ہو گئے ہیں کہ گویا اس کے پرستار ہو گئے ہیں، اس کے سامنے نگاہیں جھکائے سراپا ذلت وبندگی بنے کھڑے ہیں، ان لوگوں نے مغرب کے اصولوں واقدار کو ناقابل اختلاف مسلمہ حقیقت مان لیا، مغرب کے جو اصول اسلام سے

۱- متفق علیہ، بخاری، فضائل اصحاب النبیؐ: ۳۶۵۱، مسلم: فضائل الصحابہ: ۳۵۹۴، مسند احمد: ۳۵۴۳، ترمذی: مناقب: ۳۸۵۹، ابن ماجہ: احکام: ۲۳۶۲، بروایت ابن مسعود۔

ہم آہنگ ہیں ان کے تذکرے پر نعرۂ تکبیر بلند کر دیتے ہیں، اور جن امور میں اسلام ومغرب میں اختلاف پایا جاتا ہے ان میں یا تو ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے ہیں یا پھر معذرت وتحریف کرنے لگتے ہیں، گویا کہ ان کے نزدیک اسلام کے لئے مغربی تہذیب فلسفہ واقدار کی تقلید لازمی ہے، اسٹیچو، لاٹری، سودی انٹرسٹس، اجنبیہ کے ساتھ خلوت، زن کے ناز ن ہونے اور مرد کے سونے وریشم پہننے کی حرمت جیسے مسائل پر ان لوگوں کی گفتگو میں یہ پہلو ہمیں واضح طور پر نظر آتا ہے، اسی طرح طلاق اور تعدد ازدواج وغیرہ کی حلت کی بابت ان لوگوں کا کلام بھی ایسا ہی ہوتا ہے، گویا کہ ان کے نزدیک حلال وہ ہے جسے مغرب حلال قرار دے، اور حرام وہ ہے جسے مغرب حرام قرار دے، ان لوگوں کی نظروں سے یہ حقیقت اوجھل ہوگئی ہے کہ اسلام اللہ کا کلمہ ہے، اور اللہ کا کلمہ ہمیشہ غالب رہتا ہے، اس کا اتباع کیا جاتا ہے، وہ کسی کا اتباع نہیں کرتا، وہ بالاتر رہتا ہے، کوئی اور اس پر بالاتر نہیں ہوتا، کیا رب بندہ کا یا خالق مخلوق کی خواہشات کا تبع ہوسکتا ہے؟ ''وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ'' [مومنون:۷۱] (اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہوجاتا)، ''قُلْ هَلْ مِن شُرَكَائِكُم مَّن يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ قُلِ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ أَفَمَن يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَن يُتَّبَعَ أَمَّن لَّا يَهِدِّي إِلَّا أَن يُهْدَى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ'' [یونس:۳۵] (ان سے پوچھو تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف راہ نمائی کرتا ہو؟ کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، پھر بھلا بتلاؤ، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی راہ نمائی کی جائے؟ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے، کیسے الٹے الٹے فیصلے کرتے ہو؟)، یہ ایک گروہ ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو حلال وحرام کے مسائل کی بابت متعین آرا کے سلسلے میں کسی کتاب کی عبارت پر جمود کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہے، اور ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں ہے،

اور اس کتاب میں لکھے کو اسلام سمجھتا ہے، وہ اپنی رائے سے بال برابر نہیں ہٹتا ہے، اور اپنے مسلک یا اپنی رائے کے دلائل کو پرکھنے اور دوسروں کے دلائل سے موازنہ کرنے کے بعد حق کی تلاش پر آمادہ نہیں ہے۔

میری یہ کوشش رہی ہے کہ میں ان دونوں گروہوں سے اپنے آپ کو الگ رکھوں۔

اللہ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول ماننے کے بعد میں مغرب کو اپنا قبلہ وکعبہ نہیں مان سکتا۔

تمام مسائل میں میری رائے کسی ایک ہی مسلک کی پابند نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ ایسا کورانہ اتباع (بقول ابن جوزی) نا قابل یقین اور عقل کی منفعت سے محروم کرنے والا ہے، اس لئے کہ عقل غور وفکر کے لئے دی گئی ہے، اور چراغ ملنے کے بعد اگر کوئی شخص اس کو بجھا دے اور تاریکی ہی میں چلتا پھرے تو یقیناً بہت برا اور بد بخت ہے (تلبیس ابلیس: ص: ۸۱)۔

جی ہاں! میں نے اپنے آپ کو عالم اسلامی میں رائج کسی فقہی مسلک کا پابند بنانا نہیں چاہا ہے، اس لئے کہ حق کسی ایک مسلک میں منحصر نہیں ہے، ان رائج مسالک کے ائمہ نے اپنے معصوم ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا، وہ تو حق کی دریافت کے لئے اجتہاد کرتے تھے، اگر کسی مسئلہ میں ان کی رائے غلط ہوگی تو انہیں ایک اجر ملے گا اور اگر صحیح ہوگی تو دو اجر ملیں گے، امام مالک کا ارشاد ہے:

''میری رائے صحیح ہے خطا کا احتمال رکھتی ہے، دوسرے کی رائے غلط ہے صحت کا احتمال رکھتی ہے''۔

جو عالم موازنہ وترجیح کی صلاحیت رکھتا ہو اس کے لئے کسی ایک ہی مسلک کی اسیری یا ایک ہی فقیہ کا اتباع زیبا نہیں ہے، بلکہ اس پر دلیل کا پابند ہونا لازمی ہے، پس جس رائے کی دلیل قوی تر ہو وہ زیادہ لائق اتباع ہے، اور جس رائے کی دلیل کمزور ہو تو اس کا قائل خواہ کوئی ہو وہ نا قابل قبول ہے، حضرت علیؓ نے فرمایا تھا: حق کا پتہ لوگوں سے نہیں چلتا، حق کو جان لو حق والوں کو بھی جان لو گے''(۱)۔

۱- ملاحظہ ہو: ہماری کتاب: ''الحلال والحرام: ص ۱۰-۱۲۔

یہ تو ہم نے اپنی کتاب "الحلال والحرام" میں بہت پہلے لکھا تھا، پھر بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے اوائل میں جب معاصر اسلامی بیداری کا آغاز ہوا تو مجھے اس منہج کی ضرورت کا اور زیادہ احساس ہوا اور میں نے اس پر مزید توجہ دی۔

میرے اس رجحان کی دلیل میری متعدد کتابوں کے نام ہیں، مثلاً "الفقه الإسلامي بين الأصالة والتجديد"، "الصحوة الإسلامية بين الجحود والتطرف"، الصحوة الإسلامية بين الاختلاف المشروع والتفرق المذموم"، "الفتوى بين الانضباط والتسيب"، "الاجتهاد بين الانضباط والانفراط"، "ثقافتنا بين الانفتاح والانغلاق "اور" ثقافتنا العربية الإسلامية بين الأصالة والمعاصرة "، وغیرہ ان تمام کتابوں کے نام ہی یہ بتا دیتے ہیں کہ ان میں افراط وتفریط کے درمیان کا معتدل موقف اختیار کیا گیا ہے۔

میں نے اپنی متعدد کتابوں میں اس منہج کے عناصر یا بعض عناصر پر اختصار کے ساتھ گفتگو کی ہے، جیسے: "الصحوة الإسلامية بين الجحود والتطرف"، الصحوة الإسلامية وهموم الوطن العربي والإسلامي، أولويات الحركة الإسلامية في المرحلة القادمة" "الصحوة الإسلامية من المراهقة إلى الرشد "اور" خطابنا الإسلامي في عصر العولمة" میں۔لیکن ان عناصر پر کسی مستقل کتاب میں میں نے تفصیلی گفتگو نہیں کی ہے۔

چند برس قبل بعض دین دار حضرات اس منہج کو غلط قرار دینے لگے، اور ہم علم بردارانِ اعتدال پر دین واحکام شریعت کی بابت تساہل کی تہمت لگانے لگے، جب کہ مذہب بیزار اور کمیونسٹ لوگ ہم پر شدت پسندی کی تہمت لگاتے ہیں، "اعتدال" کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے، افراط وتفریط دونوں میں مبتلا لوگ اس پر تنقید کرتے ہیں۔

کل تک جو لوگ ہم پر تنقید کرتے تھے ان میں سے بہت سے لوگ اب ہمارے منہج "اعتدال" کی دعوت دینے لگے ہیں، یہاں تک کہ بہت سے حکام بھی اس کے ثنا خواں اور

داعی ہوگئے ہیں، اس لئے کہ عصر حاضر، عالمی حالات، خطہ کے حالات اور امت کو درپیش مسائل اسی رجحان کو اپنائے جانے کے متقاضی ہیں، یہ تمام چیزیں ہمارے منہج کے راجح ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

آج امت کو "اعتدال" کی ضرورت ہے:

امت مسلمہ کو آج جس تباہی و بربادی کا سامنا ہے، منہج اعتدال اس میں سفینۂ نجات ہے۔

امت کو درپیش اکثر بڑے فکری و عملی مسائل میں حقیقت دو متضاد رجحانوں کے درمیان چھپ جاتی ہے، ایک طرف غلو، انتہا پسندی یا افراط کا رجحان ہوتا ہے، یہ رجحان امت کو مشقت وحرج میں مبتلا کرتا ہے، شریعت کی عطا کردہ سہولتوں کو ختم کر کے اسے مشکلوں میں ڈالتا ہے، دین کی عطا کردہ آسانیوں کی جگہ پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے، امت کے لئے رخصتوں کی گنجائش نہیں مانتا، ضرورت کے مواقع میں جو شرعی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں ان کو تسلیم نہیں کرتا، جو حالات احکام میں تخفیف کا باعث ہوتے ہیں انہیں نہیں تسلیم کرتا، زمانہ، علاقہ اور حالات کی تبدیلی سے احکام میں تبدیلی کا قائل نہیں ہوتا، طرز کہن پر اڑتا ہے، آئین نو سے ڈرتا ہے، حال و مستقبل سے ناواقف رہتا ہے، اس رجحان کے حاملین کے نزدیک سب سے زیادہ حکیمانہ قول یہ ہوتا ہے کہ: "متقدمین نے متاخرین کے لئے کچھ نہیں چھوڑا ہے، ماضی کے علما کی آرا کے بعد کوئی نئی رائے سامنے نہیں آسکتی ہے"، وہ دوسرے نقطۂ نظر پر غور اور گفتگو کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور کسی مخالف رائے والے کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھتے۔

دوسرا رجحان دینی احکام سے فرار، تفریط اور کوتاہی کا ہے، اس رجحان کے حاملین نہ کسی عقیدہ کے پابند ہوتے ہیں، نہ کسی فریضہ پر کاربند، اور نہ ہی کوئی حرام ان کے نزدیک حرام ہوتا ہے، ان کے نزدیک دین موم کا ہوتا ہے جسے جو چاہے، جب چاہے، جیسا چاہے بنالے، دین میں ان کے نزدیک ناقابل تغیر احکام نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ہر دینی حکم ان کے نزدیک قابل تغیر ہوتا ہے، جسے

کسی بھی نئے مطالعہ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے، حق کو باطل اور باطل کو حق قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس رجحان کے حاملین کے نزدیک قرآن وحدیث کے محققین ایک نیا دین تشکیل دے سکتے ہیں، یہ اس دین سے بالکل الگ ہوسکتا ہے جس کی تعلیم رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کو اور صحابہ نے تابعین کو دی تھی، اور جس پر خیر القرون میں عمل ہوتا آیا ہے، نیز جو امت کو تواتر کے ساتھ پہنچا ہے، یہ نیا دین ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جن کو امت چودہ صدیوں سے حلال مانتی چلی آرہی ہے، اور جن چیزوں کو امت چودہ صدیوں سے حرام کہتی آرہی ہے یہ نیا دین اسے حلال کہہ سکتا ہے، عقائد واقدار میں تبدیلی لاسکتا ہے، فرائض ساقط کرسکتا ہے، اور دین میں وہ احکام مشروع کرسکتا ہے جن کی اجازت اللہ نے نہیں دی ہے۔

اس لئے ان لوگوں کے نزدیک ہر زمانہ، ہر علاقہ، ہر گروہ بلکہ ہر شخص کا الگ دین ہوسکتا ہے، ان کے نزدیک دین پوری امت کو ایک لڑی میں نہیں پروسکتا ہے، بلکہ اس دین کی بنیاد پر ایک ایسی امت وجود میں نہیں آسکتی ہے جس کا عقیدہ ایک ہو، شریعت ایک ہو، اقدار یکساں ہوں اور پیغام ایک ہو، بلکہ دین جوڑنے کا نہیں تفریق کا ذریعہ ہے، تعمیر کا نہیں تخریب کا ذریعہ ہے، اس لئے کہ تہذیب، سماجی علوم، لسانی مطالعات، اینتھروپولوجی، اپسٹلوجی اور دیگر معروف وغیر معروف علوم کے علمی وفلسفیانہ مؤثر امور میں تبدیلی سے اس دین میں تبدیلی ہوسکتی ہے، یہ امور خود بھی قابل تغیر اور متضاد ہیں۔

اصول دین، اصول فقہ، اصول تفسیر اور اصول حدیث میں امت کے عظیم ترین علما نے جو اصول وضوابط طے کئے ہیں وہ ان لوگوں کے لئے ناقابل اعتنا ہیں۔

ان کے کچھ ''معصوم'' ائمہ ہیں، جن کی وہ تقلید واتباع کرتے ہیں، یہ ائمہ جو کچھ کہہ دیں ان کے یہ متبعین ان سے اس پر کوئی جرح نہیں کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ جو کہہ دیں وہ سچ ہوتا ہے، ان کی ہر رائے حق اور مبنی بر صواب ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی امت کے عظیم ترین ائمہ، صحابہ، تابعین اور ان کے عظیم شاگردوں کا اتباع کرے تو یہ لوگ اس پر زبردست تنقید

کرتے ہیں، جب کہ امت کے یہ عظیم ائمہ طلب علم، حسن فہم، تقوائے خداوندی اور راہ ہدایت وخیر پر گامزن ہونے کے سلسلے میں لائق اتباع ہوتے ہیں۔

یہ تجدد پسند اپنے مغربی ائمہ کا مکمل اتباع کرتے ہیں، ان کی ہر بات کو بنا چون وچرا اور بنا جانچے پرکھے نقل کرتے ہیں۔

پھر ہمارے سامنے اپنی بابت آزادی وروشن خیالی کا دعویٰ کرتے ہیں، اگر ان کو آزاد کہا جاسکتا ہے تو یہ بس اسلامی اقدار واصولوں سے آزاد ہیں، اور سچی بات یہ ہے کہ یہ آزادی نہیں انحراف ہے، اور یہ مغربی فکر کے غلام ہیں۔

وہ امت جس کو اللہ نے معتدل کہا تھا: ''وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً'' [بقرہ:۱۴۳] وہ من حیث المجموع معصوم ہے، کسی گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی ہے، اسی لئے وہ ان منحرفین کے منہج کو صحیح نہیں قرار دیتی ہے، وہ ان کے منہج کو بھی غلط قرار دیتی ہے اور ان غلو پسندوں کے منہج کو بھی غلط سمجھتی ہے جن کی بابت رسول اکرم ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں ہلاکت وبربادی کی پیشین گوئی فرمائی تھی (۱)۔

اسی لئے وارثان انبیاء (یعنی وہ علما جو علم نبوت اور میراث رسالت کے حاملین ہیں، دین سے غلو پسندوں کی تحریف، باطل پسندوں کے اضافوں اور جاہلین کی تاویلوں کو دور کرتے ہیں) کی ذمہ داری ہے کہ وہ منہج اعتدال اختیار کریں، لوگوں کے لئے اس کی وضاحت کریں، اس کا دفاع کریں اور اس کی خصوصیات کو اجاگر کریں، ''الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین'' نے یہی منہج اختیار کیا ہے، ۲۰۰۴ء کے موسم گرما میں لندن میں جب اس کی جنرل باڈی کی پہلی میٹنگ ہوئی تو اس کے ارکان میں میری ایک تحریر تقسیم کی گئی جس میں میں نے اس منہج اعتدال کے بیس عناصر تحریر کئے تھے۔

پھر جب اتحاد کے ایگزیکیٹیو آفس کے ذمہ داران نے مجھ سے اتحاد کے لئے

۱- مسلم: علم: ۲۶۷، مسند احمد: ۳۶۵۵، ابوداؤد: سنۃ: ۴۶۰۸، بروایت ابن مسعود۔

"المیثاق الإسلامي" لکھنے کا مطالبہ کیا تو اس کی تحریر کے وقت میرا مقصد یہ رہا کہ وہ اس معتدل فکر ومنہج کا آئینہ ہو جس کی میں اور وہ جمہور دعوت دیتے رہے ہیں جن کا اپنی شریعت پر ایمان محکم ہے، اور جو اپنے علمی ورثہ سے استفادہ کرتے ہیں نیز اپنے زمانہ سے ناواقف نہیں رہتے ہیں، الحمدللہ اس "میثاق" میں یہ مقصد پورا ہو گیا، ایگزیکیٹیو آفس نیز بورڈ آف سکریٹریز کے عہدہ داران نے میری تحریر کو اجمالی طور پر قبول کر لیا، بس کچھ ملاحظات پیش کیے، جنھیں میں نے تحسین، اضافہ اور تبدیلی کے ساتھ قبول کر لیا، پھر یہ "میثاق" اپنی آخری صورت میں سامنے آیا اور مختلف مسالک وطبقات کے علما نے اسے تسلیم کر لیا۔

اب متوازن اعتدال کا منہج علماء امت میں مقبول ہو گیا ہے۔

اصل اہم کام یہ ہے کہ ہم اعتدال کو اچھی طرح سمجھیں، اس کو تطبیق دیں، تاکہ علم وعمل اور فکر وروش میں یکسانیت پائی جائے۔

☆☆☆

اعتدال کے اہم عناصر

اس منہج اعتدال پر گامزن ہونے کا دعویٰ کہیں ایسے لوگ نہ کرنے لگیں جو نہ اس سے صحیح طور پر واقف ہوں اور نہ اس کا تصور ان پر واضح ہو، اس لئے میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ اس منہج کے فکری و شرعی اصولوں سے عبارت اس کے اہم عناصر کی قارئین کے لئے تشریح کردوں، تاکہ جو اس راستہ پر چلنا چاہے وہ واضح دلائل کی روشنی میں یہ راہ اختیار کرے:

''أَفَمَن يَمْشِي مُكِبًّا عَلَى وَجْهِهِ أَهْدَى أَمَّن يَمْشِي سَوِيًّا عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ''

[ملک: ۲۲] (جو شخص منھ اوندھائے چل رہا ہو وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ جو سر اٹھائے سیدھے ایک ہموار سڑک پر چل رہا ہو)۔

یہ بات بھی بہت ضروری ہے کہ ہم ''اعتدال'' کے تصور کو ایسا گنجلگ نہ چھوڑیں کہ اس کی جو چاہے جیسی چاہے تشریح کرتا پھرے، ہر گروہ اپنے آپ کو اس پر عمل پیرا بتاتا رہے، اور یہ دعویٰ کرتا رہے کہ وہ جس راہ عمل کا داعی ہے وہی وہ راہ اعتدال ہے جس کی دعوت لوگ دے رہے ہیں۔

کچھ عرصہ پیشتر میں نے منہج اعتدال کے بیس اہم عناصر اختصار کے ساتھ تحریر کئے تھے، اور پھر اس تحریر کو جولائی ۲۰۰۴ء میں لندن میں منعقد ہونے والے الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین کی جنرل باڈی کے تاسیس اجلاس میں تقسیم کیا تھا۔

ایک صاحب نے مجھ سے اس کی تشریح کی اجازت طلب کی، میں نے ان سے کہا ان عناصر کی تشریح کا زیادہ حق دار میں خود ہوں، اس لئے مجھے ہی ان عناصر کی تشریح و تفصیل کرنی چاہئے، ان عناصر کی تشریح میری کتابوں میں موجود ہے، لیکن جا بجا بکھری ہوئی ہے، اس

لئے یہ ضروری ہے کہ ان تمام عناصر کو یکجا مرتب کرکے ان کے دلائل ذکر کیے جائیں، ان کی فروع کو ان کے اصول سے اور ان کی جزئیات کو ان کی کلیات سے مربوط کیا جائے تاکہ قارئین کے لئے یہ بالکل واضح ہو جائیں اور ان کی بابت کسی طرح کی کوئی غلط فہمی نہ بچے۔

ہر مصنف اپنی تحریر کو مزید بہتر کرنا چاہتا ہے، تاکہ اس کی تحریر اپنے مشتملات اور اسلوب کے اعتبار سے مکمل ہو جائے، اسی طرح میں نے بھی جب ان بیس عناصر پر نظر ثانی کی تو ان کو از سر نو ترتیب دیا، ان کی کچھ تفصیل بھی کی، نتیجتاً ان کی تعداد تیس تک پہنچ گئی، پھر میں نے ان میں اختصار کیا، تاکہ جو لوگ ان کو یاد رکھنا چاہیں وہ یاد رکھ سکیں۔

اس تحریر سے میرا مقصد اس منہج اعتدال کو اختیار کرنے کی خواہش رکھنے والوں کے سامنے اس کی ایسی وضاحت وتشریح ہے کہ اس کی صورت اور اس کے عناصر واضح ہو جائیں، اس کی بنیادیں سامنے آجائیں اور اس کی خصوصیات آشکارا ہو جائیں۔

اب یہ تحریر اپنی آخری صورت میں آپ کے سامنے پیش ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کی ایسی تشریح کی توفیق مجھے دے جیسی تشریح میں کرنا چاہتا ہوں۔

☆☆☆

اعتدال کے عناصر کا بیان

اسلام کا ہمہ گیر فہم:

ا۔ اسلام کا ایسا ہمہ گیر فہم جیسا اسے اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا تھا، یعنی عقیدہ وشریعت، علم وعمل، عبادات ومعاملات، ثقافت واخلاق، حق وقوت، دعوت وریاست، دنیوی ودینی امور اور تہذیب جیسے تمام امور پر مشتمل دین کی حیثیت سے اس کا مکمل فہم، اور اسلامی احکام وتعلیمات میں کی جانے والی ہر تقسیم کا رد، مثلاً بعض لوگ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کو قبول کرتے ہیں، عبادت سے متعلق اس کے احکام کو نہیں مانتے، یا بعض لوگ تعبدی احکام مانتے ہیں لیکن اخلاقی تعلیمات سے انحراف کرتے ہیں، اس کے عقائد کو تسلیم کرتے ہیں اس کی شریعت پر عمل نہیں کرتے، شادی سے متعلق اس کے احکام مانتے ہیں طلاق کے متعلق نہیں، صلح کی بابت اس کی تعلیمات کو قبول کرتے ہیں جہاد کی بابت نہیں، اسے بطور دین تو قبول کرتے ہیں، لیکن ریاست وحکومت کی بابت اس کے احکام نہیں مانتے، ایسے نظریات کو اسلام بالکل رد کردیتا ہے، قرآن میں ارشاد ہوا ہے: "وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ" [مائدہ:۴۹] (تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو، اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو، ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے)۔

قرآن وحدیث کی مرجعیت:

۲- قانون سازی، اسلامی زندگی اور اس امت مسلمہ کی رائی نمائی کے لئے قرآن وحدیث کی مرجعیت پر ایمان جو اپنے عقائد،قوانین، آداب، اخلاق،تصوارت اور اصول ان ہی دونوں معصوم مصادر سے اخذ کرتی ہے۔لیکن جزوی نصوص کو اسلام وشریعت اسلامی کے کلی مقاصد کی روشنی سمجھنا ضروری ہے، جزوی وکلی نصوص میں تعارض،صرف جزوی نصوص پر اکتفا کر کے کلی نصوص سے نظر کرنا اور صرف کلی نصوص پر اکتفا کرے جزوی نصوص کی رعایت نہ کرنا صحیح رویہ نہیں ہے،نصوص کے ظاہر پر تمسک بھی غلط ہے لیکن ان کی غلط تاویل سے بچنا بھی ضروری ہے،اسی طرح متشابہات پر عمل اور محکمات کا ترک بھی ناجائز ہے۔

ربانی صفات واقدار کی ترسیخ:

۳-اساس دین کی حیثیت رکھنے والی ربانی صفات واقدار کی ترسیخ،مثلاً اللہ اور اس کی توحید پر ایمان ، آخرت اور وہاں کے حساب کتاب نیز جنت ودوزخ کا یقین، ، خشیت وتقوائے خداوندی کا استحضار، یہ ایک قلبی عمل ہے،عبادتِ خداوندی پر تخلیق انسانی کی غایت ہونے کے اعتبار سے توجہ،اور اس عبادت کو صرف اللہ کے لئے کرنا۔ یہ اقدار ومعانی چار عظیم ترین شعائر: نماز، زکاۃ، روزہ وحج میں سامنے آتے ہیں،ان کے ساتھ ہی ساتھ دیگر مندوب عبادات مثلاً تلاوتِ قرآن، ذکر، دعا واستغفار بھی ان ربانی صفات کے مظاہر ہیں۔

ان کے علاوہ باطنی عبادات مثلاً سچی نیت، اخلاص، محبت خداوندی، اللہ کی رحمت کی امید اور اس کے عذاب سے خوف، اس کی نعمتوں پر شکر اور آزمائشوں پر صبر، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت پر توجہ یہ باطنی عبادات اس حقیقی تصوف کی اساس ہیں جس کی بنیاد اللہ کے ساتھ محکم تعلق اور بندوں کے ساتھ خوش اخلاقی پر ہے۔

ان ربانی صفات کو دعوت، تربیت، ثقافت و ابلاغ کے ذریعہ محکم کرنا واجب ہے۔

جو تصوف کے بالکلیہ انکاری ہیں ہم ان کے موقف کو بھی غلط سمجھتے ہیں، اور ان لوگوں کا موقف بھی ہمارے نزدیک غلط ہے جو تصوف کو آلودگیوں کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں، یعنی اس میں جو مشرکانہ عقائد، بدعتی عبادات، اور غلط طریقۂ تربیت در آیا ہے اس کو بھی صحیح قرار دیتے ہیں۔

شرعی احکام کے مراتب کی رعایت:

۴-شرعی احکام و اعمال کا ایسا متوازن فہم جو انہیں ان کے شرعی مراتب میں رکھتا ہے، اور ہر حکم کو وہ مقام دیتا ہے جو مقام اس کا نصوص سے معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ نصوص نے اعمال کے درمیان فرق مراتب کیا ہے: "أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ" [توبہ:۱۹] (کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھیرالیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخر پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں)۔ لہٰذا یہ جائز نہیں ہے کہ چھوٹے حکم کو بڑے حکم کا درجہ دیا جائے یا بڑے حکم کو چھوٹے حکم کا درجہ، اسی طرح راجح کو مرجوح کے بالمقابل آگے نہیں بڑھایا جا سکتا، لہٰذا عقیدہ عمل کے بالمقابل، اصول فروع کے بالمقابل، فرائض نوافل کے بالمقابل، فرائض رکنیہ غیر رکنی فرائض کے بالمقابل اور فرائض عینیہ کو فرائض کفایہ کے بالمقابل ترجیح دی جائے گی، اسی طرح شرک گناہ سے، کبیرہ گناہ صغیرہ سے اور متفق علیہ حرام مختلف فیہ حرام سے شدید تر ہے، کیفیت کو کمیت پر، جوہر کو شکل پر، باطن کو ظاہر پر اور اعمالِ قلوب کو اعمالِ جوارح پر مقدم مانا جائے گا۔

قطعیات کو ظنیات پر، نص سے ثابت حکم کو اجتہاد سے ثابت حکم پر اور متفق علیہ کو مختلف فیہ پر ترجیح دی جائے گی، اسی کو ہم "فقہ الأولویات" کہتے ہیں۔

اخلاقی اقدار:

۵- ان اخلاقی اقدار پر توجہ جن کی اسلام نے تاکید کی ہے، اور جنہیں ایمان کے شعبے نیز فرض عبادات کے نتائج بتایا ہے، حدیث نبوی میں آں حضرت کا ارشاد ہے: ''إنما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق ''(۱)۔ (مجھے اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے)۔

اسلام نے ان اخلاق میں کمی کو نفاق کی خصلت مانا ہے، خواہ یہ انفرادی اخلاق ہوں جیسے: سچ بولنا، امانت داری، وفائے عہد، لڑائی میں انصاف، تواضع، حیا، سخاوت، شجاعت اور پاک دامنی، یا اجتماعی اخلاق ہوں جیسے: انصاف واحسان، والدین کے ساتھ حسن سلوک، صلہ رحمی، پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک، کمزوروں پر رحم، نیکی وتقوی کے کاموں میں تعاون، جماعت المسلمین کے ساتھ رہنا، رشتہ داروں مساکین اور مسافروں کی رعایت، فضول خرچی اور بخل نہ کرنا۔

ان لوگوں کے موقف کو غلط قرار دینا جو شعاری عبادات کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں، خواہ یہ عبادتیں ان کے اخلاق وکردار پر اثر انداز نہ ہوں، اسی طرح ان لوگوں کے موقف کو بھی غلط سمجھنا جو اخلاق کو سب کو کچھ سمجھتے ہیں خواہ وہ فرائض ادا نہ کریں۔

اہل افراد کے ہاتھوں برمحل تجدید واجتہاد:

۶- دین کے اندر سے ہی اس کی تجدید، اور اس اجتہاد کا احیا جس کے بغیر شریعت ایک زندہ شریعت نہیں رہ سکتی، خواہ اجتہاد مستقل ہو یا انتخابی، کلی ہو یا جزوی، انفرادی ہو یا اجتماعی، بشرطیکہ اجتہاد ایسے اہل افراد کے ہاتھوں وجود میں آئے جن میں اس کی تمام شرطیں

۱- بخاری: الأدب المفرد: ۱/ ۱۰۴، مسند احمد: ۸۹۵۲ مسند میں ''صالح الأخلاق'' کے الفاظ ہیں، اس کے محققین نے اسے قوی وصحیح قرار دیا ہے، حاکم: تواریخ المتقدمین من الأنبیاء والمرسلین: ۲/ ۶۷۰ حاکم نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے، بیہقی: شعب الایمان: ۶/ ۲۳۰ بیہقی: سنن کبری: کتاب الشہادات: ۱/ ۱۹۱، بروایت حضرت ابو ہریرہؓ۔

پائی جاتی ہیں اور صحیح محل پر ہو، یعنی ان قطعی امور میں نہ ہو جو امت کی عقائدی، فکری، شعوری اور عملی وحدت کے مظاہر ہیں، ان امور کی تعداد گو کہ کم ہے، لیکن یہ بہت اہمیت کے حامل ہیں، اس لئے کہ یہ ان ''ثوابت'' (ناقابل تغیر احکام) سے عبارت ہیں، جنہیں کسی بھی صورت میں کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اور ان لوگوں کے موقف کو غلط قرار دینا جو اجتہاد کا دروازہ بند کر کے تمام علما کے لئے کورانہ تقلید کو واجب قرار دیتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کے موقف کو بھی غلط کہنا جو ہر کس وناکس کے لئے تجدید واجتہاد کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔

قابل تغیر اور نا قابل تغیر کے درمیان توازن:

۷-شریعت کے نا قابل تغیر احکام اور زمانہ کے متغیر حالات کے درمیان توازن قائم کرنا۔ نہ ہی شریعت کے نا قابل تغیر احکام سے غفلت برتنا جائز ہے اور نہ ہی قابل تغیر امور سے صرف نظر کرنا، نا قابل تغیر کو قابل تغیر کا مقام دینا یا اس کا برعکس کرنا غلط ہے، بلکہ فتوے کی تبدیلی اور دعوت وتعلیم کے اسلوب میں زمانہ، علاقہ، حالات اور عرف کی تبدیلی کے اثرات کا خیال رکھنا نیز اہداف وغایات میں ثبات اور وسائل وطریقہ ہائے کار میں لچک اور ارتقا کی رعایت کرنا ضروری ہے، اسی طرح اصول وکلیات کو ثابت سمجھنا اور فروع وجزئیات کو لچک دار ماننا بھی لازمی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم اس تجدید کو قبول کرتے ہیں جو سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی وارتقا کا ساتھ دے، اور اس مغرب پرستی کو قبول نہیں کرتے ہیں جو امت کو جدیدیت یا گلوبلائزیشن کے نام پر اس کی اپنی ساخت سے محروم کر کے دیگر امتوں کا تابع بنانا چاہتی ہے۔

ان لوگوں کے موقف کو غلط قرار دینا جو کاروان حیات کو شریعت کے نام پر جمود کا شکار کرنا چاہتے ہیں، اور ان لوگوں کے موقف کو بھی غلط قرار دینا جو بقول رافعیؒ دین، زبان، سورج

اور چاند بدل دینا چاہتے ہیں۔

تیسیر کا منہج اختیار کرنا:

۸-فقہ وفتویٰ میں تیسیر وتخفیف کا منہج اختیار کرنا، اس لئے کہ قرآن نے اس منہج کی تعلیم دی ہے: "يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" [بقرہ:۱۸۵] (اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لئے تنگی نہیں چاہتا)۔ "وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ" [حج:۷۸] (اور اللہ نے تمہارے لئے دین میں کوئی حرج نہیں بنایا ہے)۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی تعلیم دی تھی: "يسروا ولا تعسروا" (۱)، (آسانیاں پیدا کرو، تنگیاں پیدا نہیں کرو)، ایک اور موقعہ پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: "إنما بعثتم ميسرين ولم تبعثوا معسرين" (۲)، (تمہیں آسانیاں پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے مشکلیں پیدا کرنے والا نہیں)۔ اسی منہج کا نتیجہ ہیں: ایجاب وتحریم کے دائرہ کو محدود کرنا، بالخصوص حاجت کے مواقع پر رخصتوں پر فتویٰ دینا، نیز قاعدۂ شرعیہ "الضرورات تبيح المحظورات" (مجبوریاں ممنوعات کو جائز کر دیتی ہیں)، اور قاعدہ "الحاجة تنزل منزلة الضرورة" (حاجت ضرورت کے قائم مقام ہو جاتی ہے) پر عمل کرنا، غیر منصوص مسائل میں مصادر تشریع میں وسعت اختیار کرتے ہوئے استصلاح، استحسان، عرف اور سدّ ذریعہ وغیرہ کا استعمال کرنا، اگر تشدید کی ضرورت ہو تو اصول میں کی جائے فروع میں نہیں، رسول اکرم ﷺ نے غلو اور تشدید سے منع فرمایا ہے۔

تیسیر یوں تو ہر زمانہ میں مطلوب ہے، لیکن عصر حاضر میں (جب کہ مادیات معنویات پر غالب آ گئی ہیں، زندگی پیچیدہ ہو گئی ہے، خیر کے موانع اور شر کے بواعث کی کثرت ہو گئی ہے) یہ اور زیادہ مطلوب ہے۔

۱- بخاری: علم: ۶۹، مسلم، جہاد وسیر: ۱۷۳۴، مسند احمد: ۱۳۱۷۵، ابوداؤد: ادب: ۴۷۹۴، بروایت حضرت انسؓ۔

۲- بخاری: وضوء ۲۲۰، مسند احمد: ۷۲۵۵، ابوداود: طہارۃ: ۳۸۰، ترمذی: طہارۃ: ۱۴۷، نسائی: طہارۃ: ۵۶، بروایت حضرت ابوہریرہؓ۔

تیسیر سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اسے صحیح قرار دے دیا جائے، مغرب پسندی کی جائے، نصوص میں تحریف کر کے حکمرانوں کو راضی کیا جائے، پھر وہ حرام کو حلال کریں، اور احکام شریعت میں تبدیلی کریں، یہ نا قابل قبول رویہ ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ان لوگوں کا رویہ نا قابل قبول ہے جو اللہ کے آسان کئے ہوئے امور میں سختیاں پیدا کرتے ہیں، اور تخفیف والے تمام اقوال سے اعراض کرتے ہیں۔

دعوت کے لئے منہج تبشیر:

۹- چونکہ دعوت اسلامی ایک ہمہ گیر دائمی اور تمام لوگوں کو دی جانے والی دعوت ہے "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ" [انبیاء:۱۰۷] (اور ہم نے آپ کو پوری دنیا کے لئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے) اس لئے غیر مسلموں کو دی جانے والی دعوت اور مسلمانوں کو دی جانے والی دعوت (یعنی احکام اسلامی کی تعلیم، نظریات و تصورات کی تصحیح، تذکیر، حقائق اسلامی کی تشریح اور باطل کے رد) کے مناہج کا ارتقا، نیز عصر حاضر کے وسائل مثلاً ٹیلی ویژن چینلس اور انٹرنٹ وغیرہ کا استعمال کر کے دعوت اسلامی کو دنیا کے تمام لوگوں تک ان کی زبانوں میں پہنچانا، اصولوں کی رعایت کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے مزاج و مذاق کی رعایت بھی۔

قرآن مجید کے حکم کے مطابق مسلمانوں کو دعوت حکمت و موعظت حسنہ کے ذریعہ دی جائے، اور مخالفین کو (خواہ ان کا دین مختلف ہو یا ان سے اختلاف مسلک و مشرب کا ہو) بہترین مباحثہ و مکالمہ کے ذریعہ دی جائے، فتوے میں تیسیر کے منہج کے ساتھ ساتھ تبشیر کا منہج بھی اختیار کیا جائے، اس طرح وہ نبوی منہج مکمل طور پر وجود میں آجائے گا جس کا حکم ہمیں آں حضرت ختمی مرتبت ﷺ نے ان الفاظ میں دیا ہے: "یسروا ولا تعسروا، وبشروا ولا تنفروا" (۱) لوگوں کے لئے آسانیاں پیدا کرو مشکلیں نہیں، لوگوں کو خوشخبریاں دو انہیں

۱- بخاری: علم: ۶۹، مسلم، جہاد و سیر: ۱۷۳۴، مسند احمد: ۱۳۱۷۵، ابوداود: ادب: ۴۷۹۴، بروایت حضرت انسؓ۔

خوف میں مبتلا مت کرو)۔

دعوت میں تبشیر کا مطلب ہے کہ ہم خوف کے ساتھ یا اس سے پہلے رجاء کا تذکرہ کریں، وعید کے ساتھ یا وعید سے پہلے وعدوں کا تذکرہ کریں، ہمت شکن امور کے بجائے امید افزا باتیں کریں، اسلام کا تعارف دین رحمت کے طور پر کرائیں، دینِ زحمت کے طور پر نہیں، خیر کی امیدیں پیدا کرنے والے دین کے طور پر کرائیں، مایوس کرنے والے دین کے طور پر نہیں، اسے دین محبت بتائیں دین نفرت نہیں، اس کو ایسا دین بتائیں جو گفت وشنید پر یقین رکھتا ہے تصادم پر نہیں، نرم ہے تشدد پسند نہیں، لوگوں کو جمع کرنے والا ہے، انہیں بانٹنے والا نہیں، اس طرح عبادت، ثقافت، ورزش وعلم کے تقاضوں کی رعایت ہو جاتی ہے عبادت روح کی، ثقافت عقل کی، ورزش جسم کی اور علم شعور کی غذا ہے۔

حکیمانہ تدریج:

۱۰-دعوت، تعلیم، فتوے وتبدیلی میں حکیمانہ تدریج، کسی چیز کی جلدی نہ مچانا، وقت سے پہلے کوئی کام نہ کرنا، تدریج تکوینی سنت کی طرح شرعی دستور بھی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
''فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ'' [احقاف:۳۵] (پس اے نبیؐ! صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو رسول اکرمؐ پر تیئیس برس کے عرصہ میں نازل کیا، تا کہ آپ لوگوں تک رک رک کر قرآن پہنچاتے رہیں، اور تا کہ قرآن اپنے مخاطبین کی زندگی کے ارتقا کا ساتھ دے سکے، اور بدلتے ہوئے حالات میں ان کے سوالات کا جواب فراہم کرے ''وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا'' [فرقان:۳۳] (اور جب کبھی بھی وہ تمہارے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے، اس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمہیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی)۔

متضاد امور کے درمیان جمع:

۱۱- روحانیت و مادیت، ربانیت و انسانیت، عقل و قلب، دنیا و آخرت، حقوق اللہ، حق نفس اور حقوق العباد، مادی و اقتصادی ترقی اور روحانی و اخلاقی ترقی کے تقاضوں کو اس طرح جمع کرنے کی دعوت کہ ہر پہلو کو اس کا حق مل سکے، اور کوئی پہلو دوسرے پہلو کو نقصان نہ پہنچائے۔

امن و جہاد:

۱۲- امن کے خواہاں ہر شخص کے ساتھ امن کا رویہ اختیار کرنے کی دعوت، انسانیت کو ایسی تباہ کن جنگوں سے بچانا جن کی کوئی ضرورت نہ ہو، ملکوں کے درمیان صلح و معاہدوں کے قیام کی کوشش جب تک ہو سکے امن قائم رکھنے کی کوشش، لیکن ساتھ ہی ساتھ دین، مقدس مقامات، اسلامی ممالک، امت مسلمہ اور کمزور لوگوں کے دفاع کے لئے فی سبیل اللہ جہاد کرنے نیز وقت کے فرعونوں سے مقابلہ کرنے کی فرضیت پر اصرار، دشمنوں کو ڈرانے کے لئے حسب استطاعت عسکری تیاری کرنا، جہاد کی قسموں اور اس کے مختلف میدان (نفس، دعوت، تمدن، داخلی ظلم و فساد اور عسکری جہاد) کا بیان۔

امر بالمعروف، نہی عن المنکر، منکر کا حسب استطاعت ہاتھ یا زبان سے ازالہ یا کم از کم دل سے اس کو برا جاننا۔

اسلامی ممالک کی آزادی کا فریضہ:

۱۳- امت کو یہ باور کرانا کہ ہر خارجی طاقت کے قبضہ سے مسلمانوں کے ممالک کو آزاد کرانا اس کے لئے فرض جہاد ہے، لہذا قابضوں کے چنگل سے ان ممالک و علاقوں کی آزادی اور غیر ملکی قبضہ کا مقابلہ امت کے لئے ایک مؤکد دینی فریضہ ہے۔

جس سرزمین کی آزادی سب سے پہلے لازم ہے وہ سرزمین فلسطین ہے، جس پر

مغربی ممالک کی مدد سے باہر سے آکر صہیونی استعمار نے قبضہ کیا ہے، اس نے علاقہ پر قبضہ کیا، وہاں کے باشندوں کو جلاوطن کیا، ان کے خون کی ہولی کھیلی اور ان کی حرمتوں کو پامال کیا پھر ان لاشوں پر اپنی حکومت بنائی، قتل وغارت گری کے سہارے وحشی، نسل پرست وقابض صہیونی استعمار نے عالم اسلام وعالم عرب کے قلب میں اپنی ریاست قائم کردی۔

یہ مملکت جتنے حصہ پر قبضہ کر چکی ہے اتنے پر قانع نہیں ہے، اس کا اصل نظریہ یہ ہے کہ ملک اسرائیل فرات سے نیل تک ہے، اس نے پورے فلسطین پر بلکہ بعض دیگر عرب ممالک کے بھی کچھ حصوں پر قبضہ کیا۔ ابھی بھی وہ فلسطین وقریبی ممالک میں امریکی مال واسلحہ کے سہارے قتل وغارت گری کا بازار گرم کئے ہوئے ہے، امریکی پالیسی اسرائیل کو خطہ میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کررہی ہے، وہ اس خطہ کا نام بھی بدل کر شرق اوسط کبیر یا جدید رکھنا چاہتی ہے۔

امریکہ واسرائیل کے مرکب اس استعمار کا مقابلہ امت پر فرض ہے، اس لئے کہ اس استعمار نے پوری امت اسلامیہ کو اپنا ہدف بنایا ہوا ہے، یہ استعمار دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر اسلام کے خلاف جنگ چھیڑے ہوا ہے۔

مذہبی اقلیتوں کے حقوق:

۱۴- مذہبی اقلیتوں (یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں وغیرہ) کے حقوق تسلیم کرنا، اور اسلامی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ان کے مذہبی، عقائدی، عبادتی اور عائلی مسائل میں دخل اندازی نہ کرنا، اور یہ یقینی بنانا کہ وہ فقہاء اسلام کی متفقہ رائے کے مطابق ''دارالاسلام کے باشندے'' ہیں، یعنی عصر حاضر کی اصطلاح کے مطابق وہ دارالاسلام کے شہری ہیں، مسلمانوں کو حاصل حقوق انہیں حاصل ہیں، اور مسلمانوں کی سی ذمہ داریاں ان پر بھی عائد ہیں، ہاں ان امور میں ان کا معاملہ مختلف ہے جن کا تعلق مذہب الگ ہونے سے ہے، لہذا انہیں اسلامی عبادت وروایات کا پابند نہیں کیا جائے گا، جن چیزوں کو ان کے مذہب نے جائز قرار دیا ہے

تو خواہ وہ اسلام کی نگاہ میں حرام ہی کیوں نہ ہوں ان کے سلسلے میں ان غیر مسلموں پر کچھ تنگی نہیں کی جائے گی، مثلاً خنزیر کھانا اور شراب پینا وغیرہ، ان کو اہل ذمہ کہنا دینی طور پر لازمی نہیں ہے، اس لئے کہ بنو تغلب (جو کہ عرب عیسائی تھے) نے جب جزیہ کے نام پر اعتراض کرتے ہوئے حضرت عمر سے یہ کہا تھا کہ وہ خواہ ان سے دوگنی رقم لے لیں لیکن جزیہ کے نام پر نہیں زکاۃ کے اس نام پر لیں جس نام پر مسلمان دیتے ہیں، تو حضرت عمر نے ان کی یہ درخواست قبول کر لی تھی حالانکہ قرآن نے یہ نام استعمال کیا تھا۔

اگر یہ غیر مسلم ہم سے دینی وجہ سے جنگ نہ کریں، ہمیں ہمارے علاقہ سے نہ جلاوطن کریں اور نہ اس سلسلہ میں کسی کی مدد کریں تو اسلام نے ان کے ساتھ حسن سلوک وانصاف کرنے سے نہیں روکا ہے۔

عقل وفکر کا احترام:

۱۵- عقل وفکر کا احترام، انفس وآفاق میں موجود اللہ کی تکوینی آیات اور قرآن مجید میں درج اللہ کی تنزیلی آیات پر غور وتدبر کی دعوت، اس علمی فکر کی تشکیل جو خرافات کی نکیر کرے اور کوئی بھی دعویٰ بلا دلیل نہ قبول کرے، یہ وہ فکر وذہنیت ہے جو قرآن نے اپنی تعلیمات نیز آباء واجداد، پیشوایانِ قوم اور عوام الناس کی کورانہ تقلید کے خلاف اپنی مہم سے پیدا کی ہے۔ عقل کو نقل وثبوت وحی کی اساس، احکام شریعت کا مخاطب اور دین ودنیا کی سمجھ کا آلہ ماننا، نیز نقل صحیح وعقل صریح یا وحی ربانی وعقل انسانی کے درمیان تعارض کی قطعی نفی، بلکہ ان دونوں کو "نور علیٰ نور" ماننا، عقلی ونقلی دلائل میں تعارض کے وقت ظنی پر قطعی کو ترجیح دی جائے گی، اور ان دونوں کے ظنی ہونے کی صورت میں نقلی دلیل کو ترجیح حاصل ہوگی خواہ عقلی دلیل ثابت رہے یا زائل ہو جائے۔

شریعت کے نام پر عقل کو معطل وجامد کرنے والوں نیز عقل کو ہمیشہ شریعت پر ترجیح دے کر شریعت میں تحریف کرنے والوں کے موقف ہمارے نزدیک غلط ہیں۔

انسانی واجتماعی اقدار:

۱۶-ان انسانی واجتماعی اقدار واصولوں کی دعوت جن کے سلسلے میں بہت سے مسلمان تفریط کا شکار ہیں، اور کچھ مسلمان تو انہیں مغربی اقدار واصول سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ وہ درحقیقت اسلام کی ذاتی اقدار ہیں، مثلاً قضا، سیاست ومعیشت میں عدل، معاشرہ وحکومت میں شوریٰ، آزادی، عزت نفس، حقوقِ انسانی، بالخصوص معاشرہ کے کمزور طبقات کے حقوق، تمدنی، دینی اور سیاسی آزادی جو کہ معاشرہ کی ترقی اور افراد معاشرہ کے درمیان انصاف کے قیام کی بلکہ شریعت کی صحیح تطبیق کی ایک لازمی شرط ہے۔

ایسی رفاہی، تعلیمی، سماجی اور ثقافتی تنظیموں وجمعیتوں کا قیام وقت کا تقاضہ ہے جو معاشرہ کی خدمت اور ترقی پر توجہ دیں، تاکہ معاشرہ پسماندگی سے نجات پاکر ترقی کی راہوں پر گامزن ہوسکے اور اپنے تئیں، اپنی عظیم امت کے تئیں اور پوری انسانیت کے تئیں اپنی ذمہ داریاں ادا کرسکے۔

خواتین کے ساتھ انصاف اور ان کی عزت:

۱۷-اسلام نے خاتون کو انسان، مؤنث، بیٹی، بیوی اور ماں ہونے کی حیثیت سے جو حقوق دیے ہیں اور جس عظمت سے اس کو بہرہ ور بتایا ہے خواتین کو ان حقوق وعظمتوں سے بہرہ ور کرانا، اور مسلمانوں کے عہد زوال میں وہ جن محرومیوں کا شکار ہوئی ہیں ان محرومیوں سے اسے نجات دلانا، زوال کے اس عہد میں عورت کو بہت سے حقوق یہاں تک کہ مسجد میں حاضری اور انتخابِ شوہر کے اپنے حقوق سے محروم کردیا گیا ہے، اسی طرح عورت کو مغربی تہذیب کے اس سیلاب بلاخیز سے بھی نجات دلانا جس نے عورت کو اس کی فطرت سے محروم کردیا ہے، اور اس کی صفت تانیث کا بھی خیال نہیں رکھا ہے، اور جس نے مسلم خاتون کو

مغربی خاتون کے نقشِ قدم کا پیرو بنا دیا ہے، جب کہ ناقدین و مصلحین شکوہ کناں ہیں کہ اس تہذیب نے فطرت انسانی اور مرد و عورت سب پر ظلم کیا ہے۔

ہم ان غلو پسندوں کے موقف کو غلط سمجھتے ہیں جنہوں نے عورت کو گھر میں قید کر دیا ہے، نیز اسے علم، روزگار اور سماجی و سیاسی زندگی میں شرکت کے حق سے محروم کر دیا ہے۔

اسی طرح ہم ان لوگوں کے نظریہ کو بھی قبول نہیں کرتے ہیں جو مرد و زن کے درمیان پائے جانے والے فرقوں کو ختم کر کے عورت کی فطرت اور اس پوری کائنات کی فطرت کے خلاف کام کرتے ہیں جو قاعدۂ زوجیت پر ہی قائم ہے: ''وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ'' [ذاریات:۴۹] (اور ہر چیز سے ہم نے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو) یہ پوری کائنات اس ''یکسانیت'' کے قاعدہ پر قائم نہیں ہے جس کی تبلیغ آج مغرب کر رہا ہے، کاروانِ حیات دو متضاد جنسوں سے جاری و ساری ہے یکساں جنس کے ذریعہ نہیں۔

خاندان پر توجہ:

۱۸- چونکہ خاندان صالح معاشرہ کے لئے خشتِ اولیں کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس پر توجہ، اور اسے صحیح اسلامی بنیادوں پر تشکیل دینا، مثلاً رشتہ کرتے وقت بہتر انتخاب، خاطب و مخطوبہ کے درمیان ایک دوسرے کو دیکھنے کی مشروعیت، مہر و دعوتوں وغیرہ میں فضول خرچی نیز سماجی ریاکاری کے تمام مظاہر سے اجتناب، باہم محبت و ہمدردی کے تعلق پر ازدواجی زندگی کی تاسیس، زوجین میں سے ہر ایک کے ذریعہ دوسرے کے حقوق کی رعایت، اچھی معاشرت، ناپسندیدہ باتوں پر صبر، خواہ ناگواری ہی کیوں نہ ہو، اختلافات کے وقت کسی کو حَکَم بنانا، ایک ساتھ رہنا ناممکن ہو جانے کی صورت میں ہی طلاق، تعدد ازدواج کی اپنی شرطوں کے ساتھ ہی اجازت، نہ اس سلسلے میں بے جا توسع کیا جائے اور نہ تعدد ازدواج کو حرام قرار دیا جائے، خاندان کے اس وسیع تصور کو ماننا جو والدین، بھائیوں، بہنوں، چچاؤں، پھوپھیوں،

ماموؤں، خالاؤں اور ان کی اولاد کو بھی شامل ہو، نیز ان سب کے ساتھ صلہ رحمی کا جذبہ۔

حکمراں کے انتخاب میں عوام کا حصہ:

۱۹-مضبوط، امانت دار باصلاحیت اور دین دار حکمرانوں کے انتخاب میں عوام کے حق کا احترام، نہ عوام کی خواہش کو غلط طور پر پیش کیا جائے، اور نہ ان پر ان کی مرضی کے بغیر کوئی حکمراں مسلط کیا جائے، عوام کے ذریعہ حکمراں کے انتخاب کے بعد عوام پر حکمراں کا حق ہے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون و ہمدردی اور اطاعت کا تعلق رکھیں، اور عوام کا یہ حق ہے بلکہ ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا محاسبہ کریں، اس سے کوئی غلطی سرزد ہو تو اس کی راہ نمائی کریں، وہ راہ حق سے انحراف کرے تو اس کو تنبیہ کریں اور اگر سرکش و بے قابو ہو جائے تو اسے پر امن طریقوں سے معزول کردیں، نظام حکومت کی بنیاد ان امور پر ہو: عدل، شوریٰ، حقوق کی رعایت، شریعت خداوندی اور اللہ کی نازل کردہ ''کتاب ومیزان'' کی پابندی، جمہوری نظام کے ان طریقہ ہائے کار سے استفادہ جو عوام کو طاقت ور بناتے ہیں اور حکمراں کا اقتدار محدود رکھتے ہیں، لیکن اس نظام کو بالکلیہ قبول نہ کیا جائے، مثلاً فرد کی ایسی مطلق آزادی کو قبول نہیں کیا جاسکتا جس کے نتیجہ میں اخلاقی اقدار اور شرعی احکام تار تار ہوں یعنی جمہوریت کے بہتر پہلوؤں کو لیا جائے اور اس کے شر سے اجتناب برتا جائے۔

امت کی معیشت کو مضبوط کرنا اور اس کی فقہ اسلامی پر تشکیل:

۲۰-امت کی معیشت کو مضبوط کرنا، تاکہ امت ذاتی، تمدنی اور عسکری طور پر کسی اور کی محتاج نہ رہے، اس معیشت کو شریعت کی فقہ اور اس کے مقاصد کی بنیاد پر تشکیل دینا، اسلامی مالیاتی اداروں اور بینکوں کے قیام کی حوصلہ افزائی، ایسے اداروں و بینکوں کو شکل پرستی سے نجات دلانا، ان کو مزید بہتر بنانا تاکہ یہ بینک اسلامی معاشروں کی ترقی میں سرگرم کردار ادا کرسکیں،

ایسی ممتاز اسلامی معیشت کے قیام کے لئے علمی منصوبہ بندی اور عملی کاوشیں کرنا جس میں پیداوار میں اضافہ ہو، صرف کا صحیح مزاج ہو، مبادلہ مستحکم ہو اور تقسیم عادلانہ ہو۔ اسلامی معیشت کے اعتدال کو باقی رکھنا، تاکہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح معاشرہ کو نقصان پہنچا کر فرد کا حامی نہ ہو جائے، یا کمیونزم کی طرح فرد کی قیمت پر معاشرہ کو بالادست نہ کر دے۔

امت مسلمہ کی وحدت اور اس سے وفاداری:

۲۱- امت اسلامیہ کے وجود اور اس کے دوام پر اعتقاد، یہ اعتقاد کہ یہ امت ہمیشہ رہے گی اس لئے کہ یہ آخری رسالت کی حامل ہے، اس امت کے اتحاد اور اس کے فرزندوں کے درمیان دینی اخوت کی فرضیت پر یقین، اگرچہ اس میں بہت سے مکاتب فکر اور مسالک و مشارب پائے جاتے ہیں، ان تمام مختلف فرقوں کو ایک امت ماننا جو ایک قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں، اور قرآن وحدیث پر ایمان رکھتے ہیں، اس کے مختلف گروہوں کو باہم قریب لانے کی کاوش، اس طور پر کہ یہ متفقہ امور پر باہم تعاون کریں، مختلف فیہ امور میں تسامح کا رویہ اختیار کریں، عظیم مسائل میں ایک صف کی مانند کھڑے ہوں، امت کے ساتھ وفاداری کی تاکید، وفاداری کا مطلب یہ ہے کہ محبت ونصرت کا رشتہ اسی امت کے ساتھ ہو کسی اور امت کے ساتھ نہیں۔

تنوع پر یقین:

۲۲- دینی، علمی، لغوی، تہذیبی، اور سیاسی امور میں تنوع کو قبول کرنا، مختلف تہذیبوں کے پر امن بقائے باہم کے رویہ اور ان کے باہمی استفادہ کو تسلیم کرنا، اور اس رواداری کو فروغ دینا جس کا اسلام داعی ہے اور جو پوری تاریخ اسلامی میں ہمیں نظر آتی ہے۔

تکفیر و تفسیق سے اجتناب:

۲۳- ہر اس شخص کے ساتھ حسن ظن رکھنا جو توحید و رسالت کا قائل اور قبلہ کی

جانب رخ کر کے نماز پڑھتا ہو، اور اس سے کوئی خلاف عقیدہ بات نہ صادر ہو، جہاں تک ممکن ہو مسلمان کے حال کو صلاح پر محمول کرنا اور تفسیق وتکفیر سے اجتناب کرنا ہی اصل ہے۔ اسلام میں داخلہ کی کنجی کلمہ "لا الٰہ إلا اللہ، محمد رسول اللہ" ہے، لہٰذا جب تک انسان اس کا انکار نہ کرے جس کے ذریعہ وہ اسلام میں داخل ہوا تھا تب تک وہ اسلام سے خارج نہیں ہوگا، اس لئے کہ یقین شک سے زائل نہیں ہوتا ہے، غلط تکفیر ایک دینی وعلمی غلطی ہے، کسی مسلمان کے لئے اس کا ارتکاب جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے نتیجہ میں مسلمان کا مسلم معاشرہ سے تعلق ختم ہو جاتا ہے، اس لئے جب تک کوئی قطعی سبب تکفیر نہ پایا جائے تکفیر نہیں کرنی چاہئے، جیسے قرآنی قطعیات کی تکذیب، دین کی کسی یقینی تعلیم کا انکار، یا خدا اور رسول کی صریح توہین، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: "الا أن تروا كفرا بواحا، عندكم من الله برهان" (۱)، (الا یہ کہ تمہیں ایسا واضح کفر نظر آجائے جس کی بابت تمہارے پاس اللہ کی جانب سے کوئی دلیل ہو)، دلیل سے مراد قطعی دلیل ہے، اگر تاویل کی گنجائش ہو تو شک کا فائدہ ایسے متہم بالکفر شخص کو ملے گا۔

دنیا کی مسلم اقلیتیں:

۲۴- دنیا کے مختلف ممالک میں آباد مسلم اقلیتوں پر توجہ، اس لئے کہ یہ اقلیتیں بھی امت مسلمہ کا ہی حصہ ہیں، جن کے نصیب میں دیگر مذاہب کی اکثریت کے درمیان رہنا آیا ہے، امت کی ذمہ داری ہے کہ ان کی مدد کرے انہیں اس قابل بنائے کہ وہ اپنے معاشروں میں اسلام کے ساتھ زندہ وسرگرم عناصر کی حیثیت سے رہ سکیں، وہ اسلام پر مکمل طور پر عمل پیرا ہو سکیں، یعنی ان کے لئے شریعت کی روشنی میں ایسی فقہ تیار کی جائے جو ان کے حالات کی رعایت کر سکے۔ ان کا شعار ہو: دین پر استقامت، معاشرہ سے تعلق لیکن اس میں انضمام نہیں۔

۱- بخاری: فتن: ۷۰۵۵، مسلم: امارہ: ۱۷۰۹، مسند احمد: ۲۲۶۷۹، ۲۲۷۲۵، بروایت عبادہ بن صامت۔

ترقی کا حصول اور ماحولیات کی حفاظت:

۲۵- مادی وانسانی ترقی کا حصول، ماحولیات کی حفاظت اور ہر طرح کی آلودگی سے اس کا تحفظ، ماحولیاتی وتکوینی توازن کو قائم رکھنا، ہر اس کام میں تعاون کرنا جو لوگوں کے لئے زندگی کو آسان اور خوش رنگ بنائے، اور ان تمام امور کو عبادت و جہاد فی سبیل اللہ ماننا، اس زمین کے تمام باشندوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ باہم مل کر اس زمین کی حفاظت کریں، اور انہیں اگر ایسے لوگوں سے خطرات درپیش ہوں جو زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد برپا کر رہے ہیں تو ان کا ایک ساتھ مقابلہ کریں، اور تکوینی میزان کی حفاظت کریں "أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ" [رحمان:۸-۹] (کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو، انصاف کے ساتھ ٹھیک وزن کرو، اور تولنے میں کمی نہ کرو)۔ انہیں باہم دست وگریبان نہیں ہونا چاہئے، اس طرح یہ لوگ ایک ایسی متوازن تہذیب قائم کریں گے جو انسانیت کو عزت دے گی، اسے زمین میں اللہ کا خلیفہ مانے گی ایک ترقی یافتہ جانور نہیں۔

اصلاح وتبدیلی کی ضرورت:

۲۶- اصلاح وتبدیلی کے علم برداران نے پسماندگی وفساد سے مقابلہ کی ترغیب دی ہے، اس لئے کہ پسماندگی امت کی عقل کو معطل کر دیتی ہے اور فساد اس کے ضمیر کو معطل کر دیتا ہے، اور یہ ترقی کی راہ کی اولین رکاوٹ ہے، خواہ یہ فساد سیاسی ہو، اقتصادی ہو، انتظامی ہو یا اخلاقی، ان علمبرداران اصلاح کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان تمام گوشوں پر محیط حقیقی اصلاح کے لئے باہم تعاون کریں، حقیقی اصلاح تبھی پائی جائے گی جب وہ ہماری خواہش، ہمارے ہاتھوں سے، ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق اور ہمارے اہداف ومصالح کے حصول کے لئے ہو۔ وہ اصلاح جو دوسرے اپنے مفادات کے لئے ہم پر مسلط کریں اور جو ان کے ہی ہاتھوں سے یا

ان کے ایجنٹوں کے ہاتھوں سے وجود میں آئے وہ حقیقی اصلاح نہیں ہوسکتی ہے۔

ہر اصلاح کا آغاز ان ظالم سیاسی نظاموں کی اصلاح سے ہوگا جو ہماری قوموں پر مسلط ہیں، ہر آزاد زبان کو کاٹ دیتے ہیں، ہر آزاد قلم کو توڑ دیتے ہیں، ہر آزاد داعی کو قید خانہ میں ڈال دیتے ہیں، انتخابات میں دھاندھلی کرتے ہیں، اور جو آڑے آئے اس پر ایمرجنسی قوانین اور فوجی عدالتوں کے ذریعہ ظلم کے پہاڑ توڑتے ہیں، اس فساد کا علاج بس وہ بنیادی تبدیلی ہے جو عوام کو حکمرانوں کے انتخاب، ان کے محاسبہ اور ان کو معزول کرنے کا حق دے۔

اور ہر تبدیلی کی بنیاد خود انسان کی داخلی تبدیلی ہے، اس لئے کہ انسان کی بابت فیصلہ اس کے باطن کے اعتبار سے ہوتا ہے ظاہر کے اعتبار سے نہیں، عقل وضمیر کے اعتبار سے ہوتا ہے، آنکھ، ناک، اور کان کے اعتبار سے نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ" [رعد:١١] (اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حالات اس وقت تک نہیں بدلتے ہیں جب تک وہ اپنے اوصاف نہ بدل لے)۔

امت کی تمام صلاحیتوں اور تحریکوں کو جمع کرنا:

٢٧- اسلام کی خدمت میں عمل پیرا تمام صلاحیتوں، جماعتوں اور تحریکوں کو ایک ساتھ جمع کرنے کی کوشش، ان سب کا ایک تحریک یا جماعت میں انضمام ضروری نہیں ہے بلکہ غالباً مفید بھی نہیں ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ان سب کے مقاصد ایک ہوں، پروگرام ایک ہوں اور قیادت ایک ہو، یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، یک گونہ تعلق وباہمی ربط، اہم مسائل میں متحد ہونا، اور امت ودین کے دشمنوں کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن جانا بھی کافی ہے، کم ازکم سخت مصائب وآلام کے وقت تو ایسا ہو ہی سکتا ہے، اس لئے کہ مصائب وآزمائشیں دل کی دوریوں اور فاصلوں کو ختم کرکے سب کو متحد کر دیتی ہیں۔

خادمان دین کے درمیان اگر اختلاف تنوع کا ہو تصادم کا نہیں تو پھر چنداں ضرر

رساں نہیں ہے۔

ایک نئی فقہ کی دعوت:

۲۸-فقہ قرآنی ونبوی کی تجدید کی دعوت، ''قَدْ فَصَّلْنَا الآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ'' [انعام:۹۸] (جو لوگ فقہ [سمجھنے] کی صلاحیت رکھتے ہوں ہم نے ان کے لئے آیات کی تفصیل کردی ہے)، ''**من یرد الله به خیراً یفقهه فی الدین**''(۱)، (جس کے ساتھ اللہ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی فقہ [سمجھ] دیتا ہے)۔ یہ فقہ متعدد اقسام پر مشتمل ہے: فقہ کائنات، فقہ مقاصد شریعت، فقہ مآلات، فقہ الموزنات، فقہ الاولویات، فقہ الاختلاف اَوالائتلاف، فقہ حضاری، فقہ تغییر اور فقہ الواقع۔

اس عہد کے علما کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے بقدر فقہ کی ان قسموں کا علم حاصل کریں، تاکہ وہ جب کارِ دعوت انجام دیں تو بصیرت کی روشنی میں دیں، فتویٰ دیں تو دلیل کی بنیاد پر دیں، تدریس کا منصب سنبھالیں تو خود ان کے ذہن میں تصورات واضح ہوں، مقدمات فیصل کریں تو علم کی بنیاد پر کریں۔

امت کے تہذیبی کارنامے:

۲۹-امت کے حیران کن تہذیبی کارناموں نیز ان فتوحات کا تذکرہ جنہوں نے قوموں کو غلامی سے آزادی دلائی تھی، یہ فتوحات کبھی بھی تذلیل واستحصال کا ذریعہ نہیں تھیں، امت نے علم وایمان، ربانیت وانسانیت اور مادی واخلاقی ترقی کی جامع جو تہذیب قائم کی تھی اس کا تعریف کے ساتھ تذکرہ، اس تہذیب کی تشکیل میں متعدد مذاہب، نسلوں اور وطنوں کے لوگوں نے شرکت کی تھی، اسلامی تہذیب نے ان سب کے ساتھ فراخدلانہ رویہ اختیار کیا تھا،

۱- بخاری: الاعتصام بالکتاب والسنۃ: ۷۲۱۲، مسلم: زکاۃ ۱۰۳۷، مسند احمد: ۱۶۸۳۴، ۱۶۸۴۲، ابن ماجہ، مقدمہ: ۲۲۱، طبرانی: کبیر ۳۲۱/۱۹، بروایت حضرت معاویہؓ۔

آٹھ صدیوں سے زائد عرصہ تک یہ تہذیب دنیا کی معلم اور ضیا پاش رہی، یورپ کے استقرائی وتجرباتی منہج نے اسی تہذیب اور ابن رشد جیسی اس کی نمائندہ شخصیات سے ہی استفادہ کیا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے ہماری تاریخ غلطیوں سے بالکل مبرا ہے۔لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ دیگر امتوں کی تاریخ کی بنسبت اس میں منفی پہلو بہت کم ہیں، ہماری تاریخ بالخصوص خیر القرون کی تاریخ کو اگر کوئی شخص مسخ کرے تو ہمیں یہ قبول نہیں ہے، یہ خیر القرون وہ عہد ہے جس کی تعریف زبانِ نبوت نے کی تھی، امت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حال کو اگر اپنے اس روشن ماضی سے بہتر نہیں کرسکتی تو کم از کم اس کے جیسا تو بنا ہی دے، پدرم سلطان بود پر اکتفا کرنا، اور اپنے مصائب پر روتے رہنا ہرگز کافی نہیں ہے، بلکہ ماضی سے روشنی لے کر حال کو ترقی دینا اور مستقبل کو بہتر بنانا ہم پر فرض ہے۔

اپنے گونا گوں ورثہ سے استفادہ:

۳۰-فقہا کی ضابطہ بندیوں، اصولیوں کی اصول سازیوں، محدثین کے حفظ، متکلمین کی ذہانت، صوفیائی روحانیت، مؤرخین کی روایت، ادبا وشعرا کی بلند خیالی، حکما کے غور وفکر اور سائنس دانوں کے تجربات پر مشتمل اپنے گونا گوں ورثہ کے بہترین حصے سے استفادہ، لیکن یہ خیال بھی ذہن میں رہے کہ یہ مکمل ورثہ (یہاں تک کہ اس کا جو حصہ دین ومصادر دین سے متعلق ہے وہ بھی) مسلم عقل کا تشکیل کردہ ہے، لہٰذا معصوم نہیں ہے، وہ قابل نقد ونظر ثانی ہے، اس پر کلام کیا جاسکتا ہے، اس میں ترجیح وتضعیف سے بھی کام لیا جاسکتا ہے، لیکن پوری امت کسی گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی ہے، وحی الٰہی اور انسانی علم کی قطعیات کی روشنی میں اس ورثہ کو دیکھنا ضروری ہے، عصر حاضر کے وسائل واسالیب کو اختیار کر کے اس ورثہ کا احیا بھی ضروری ہے، تاکہ یہ ورثہ اس زمانہ میں بھی امت کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر کے اسے اس کی دائمی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنا سکے۔

عناصر ''اعتدال'' کا مختصر بیان

۱-اسلام کا ہمہ گیر فہم، یعنی عقیدہ وشریعت، علم وعمل، عبادات ومعاملات، ثقافت واخلاق، حق وقوت، دعوت وریاست، دینی ودنیوی امور نیز تہذیب جیسے تمام امور پر مشتمل دین کی حیثیت سے اس کا مکمل فہم۔

۲-قانون سازی اور اسلامی زندگی کی راہ نمائی کے لئے قرآن وحدیث کی مرجعیت پر ایمان، لیکن جزوی نصوص کو کلی مقاصد کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے۔

۳-ربانی صفات واقدار کی ترسیخ، تخلیق انسانی کی غایت ہونے کے اعتبار سے عبادتِ خداوندی پر توجہ، چار عظیم شعائر اور ان کے علاوہ ذکر، دعا واستغفار نیز صدق نیت، اخلاص وخشیت ربانی جیسی باطنی عبادات ان ربانی صفات واقدار کے مظاہر ہیں، یہ باطنی عبادات اس حقیقی تصوف کی اساس ہیں جس کی بنیاد اللہ کے ساتھ محکم تعلق اور بندوں کے ساتھ خوش اخلاقی پر ہے۔

۴-شرعی احکام واعمال کا وہ متوازن فہم جو انہیں ان کے مراتب میں رکھتا ہے، اور ہر حکم کو وہ مقام دیتا ہے جو اس کا نصوص سے معلوم ہوتا ہے، یعنی راجح کو مرجوح اور مرجوح کو راجح کا مقام نہ دیا جائے، اسی کو ہم ''فقہ الاولویات'' کہتے ہیں۔

۵-فقہ قرآنی ونبوی کی تجدید کی پرزور دعوت، اس فقہ کی متعدد قسمیں ہیں: ''فقہ سنن الکون، فقہ المقاصد، فقہ التغییر، فقہ الموازنات، فقہ الاختلاف، الفقہ الحضاری، فقہ المآلات، فقہ الواقع، نیز فقہ الأولویات۔

۶-جن اخلاقی اقدار کی تعلیم اسلام نے دی ہے ان پر توجہ خواہ یہ اخلاق انفرادی

ہوں یا اجتماعی، جو لوگ شعائری عبادات ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور جو صرف اخلاق کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں ان کے موقفوں کو قبول نہ کرنا۔

۷- دین کی اس کے اندر سے تجدید، اس اجتہاد کا احیا جس کے بغیر شریعت زندہ شریعت نہیں رہتی، بشرطیکہ اجتہاد اہل لوگوں کے ذریعہ ہو اور برمحل ہو۔

۸- شریعت کے ثوابت اور زمانہ کی تبدیلی کے درمیان توازن، ساتھ ہی اہداف، غایات، اصول وکلیات میں ثبات اور وسائل، فروع وجزئیات میں لچک وارتقا کی رعایت بھی ضروری ہے۔

۹- فقہ وفتوی میں تیسیر وتخفیف کا منہج اختیار کرنا، اگر تشدید کرنی ہی ہو تو اصول میں کی جائے فروع میں نہیں، اور جو تیسیر یہاں مقصود ہے اس سے مراد جو کچھ ہو رہا ہو اس کو صحیح قرار دینا یا مغرب پرستی یا حکمرانوں کو راضی کرنا نہیں ہے۔

۱۰- دعوت اسلامی چونکہ ایک عالمی دعوت ہے اس لیے غیر مسلموں کو دی جانے والی دعوت اور مسلمانوں کو دی جانے والی دعوت (یعنی احکام اسلام کی تعلیم، نظریات وتصورات کی اصلاح، تذکیر، حقائق اسلامی کی تشریح اور باطل کے رد) کے مناہج کا ارتقا، نیز دعوت میں تبشیر کے منہج کو اختیار کرنا، تاکہ فتوے میں تیسیر کے منہج کے ساتھ مل کر یہ دعوتی تبشیر مکمل طور پر مفید ہو جائے۔

۱۱- دعوت، تعلیم، فتوی اور تبدیلی میں حکیمانہ تدریج، کسی بھی چیز کی جلدی نہ کرنا، اور کوئی بھی کام وقت سے پہلے نہ کرنا، تدریج شرعی دستور ہونے کے ساتھ ساتھ تکوینی دستور بھی ہے۔

۱۲- روحانیت ومادیت، ربانیت وانسانیت اور عقل ووجدان کے تقاضوں کو اس طرح جمع کرنے کی دعوت کہ ہر پہلو کو اس کا حق مل سکے، اور کوئی پہلو دوسرے پہلو کو نقصان نہ پہنچائے۔

۱۳- امن کے خواہاں ہر شخص کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کا رویہ رکھنے کی دعوت، لیکن دین، مقدس مقامات اور کمزور ودبے کچلے لوگوں کے دفاع کے لئے جہاد فی سبیل اللہ

کرنے اور وقت کے فرعونوں کا مقابلہ کرنے کو فرض ماننا، ساتھ ہی جہاد کی متعدد قسموں: جہاد نفسی، جہاد دعوتی، جہاد تمدن وغیرہ کا بیان بھی ضروری ہے۔

۱۴- امت کو یہ باور کرانا کہ عالم اسلام کے کسی بھی حصہ پر اگر کوئی غیر قبضہ کر لے تو اس کو آزاد کرانا فرض عین ہے، سب سے پہلے فلسطین کو آزاد کرانا لازمی ہے۔

۱۵- مذہبی اقلیتوں کے حقوق تسلیم کرنا، اور ان کے ساتھ وہ رویہ رکھنا جو اسلام نے واجب قرار دیا ہے، یعنی ان کے دینی معاملات میں دخل اندازی نہ کرنا، انہیں دارالاسلام کا باشندہ ماننا، یعنی عہد حاضر کی زبان میں وہ مسلمانوں کے ہم وطن ہیں، انہیں مسلمانوں کے سے حقوق حاصل ہیں، اور جو ذمہ داریاں مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں وہ ان پر بھی عائد ہوتی ہیں، بس فرق ان امور میں ہے جن میں فرق کا متقاضی مذہبی اختلاف ہے۔

۱۶- عقل وفکر کا احترام، اللہ کی تکوینی وتنزیلی آیات میں غور وفکر، علمی ذہنیت کی تشکیل، جمود اور آباواجداد، پیشوایان قوم وعوام الناس کے کورانہ اتباع کی مخالفت، نقل صحیح وعقل صریح کے درمیان تعارض کی نفی۔

۱۷- انسانی وسماجی اخلاق واقدار مثلاً عدل، شوریٰ، آزادی، عزت نفس اور حقوق انسانی کی دعوت۔

۱۸- اسلام نے عورت کو جو مقام اور حقوق دئے ہیں انہیں یقینی بنانا، مسلمانوں کے زوال وپسماندگی کے دور میں عورت کے ساتھ جو ناانصافیاں کی گئی ہیں ان کا خاتمہ، اور مغربی تہذیب کے یلغار سے اس کو محفوظ رکھنا جس نے عورت کو اس کی فطرت سے محروم کر دیا ہے اور اس کی صفت تانیث کا بھی خیال نہیں رکھا ہے۔

۱۹- خاندان چونکہ ایک صالح معاشرہ کی خشت اولیں ہے اس لئے اس پر توجہ، زوجین میں سے ہر ایک کے ذریعہ دوسرے کے حقوق کی رعایت، جب تک ساتھ رہنا ناممکن نہ ہو جائے طلاق کو استعمال نہ کرنا، تعدد ازدواج کی اپنی شرطوں کے ساتھ اجازت، اس سلسلے میں

نہ ضرورت سے زیادہ تساہل کرنا اور نہ اس کو حرام قرار دینا۔

۲۰- عوام کو اپنے قوی وامین حکمراں کے انتخاب کا حق، عوام کی خواہشات کو غلط رنگ نہ دینا، ان پر ایسا حکمراں مسلط نہ کرنا جو ان کی مرضی کے خلاف ان کی قیادت کرے، عوام کو حاکم کے محاسبہ اور اگر وہ غلط راستے پر چل پڑے تو پر امن طریقوں سے اسے معزول کرنے کا حق حاصل ہے۔

۲۱- امت کی معیشت کو مستحکم کرنا، تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے، اس معیشت کی بنیاد شریعت کی فقہ اور اس کے مقاصد پر رکھنا، سرمایہ دارانہ واشتراکی معیشتوں سے مختلف اسلامی معیشت کی تشکیل کے لئے علمی منصوبہ بندی اور عملی کاوش۔

۲۲- امت اسلامیہ کے وجود اور اس کے دوام پر ایمان، مختلف مکاتب فکر و مسالک کے باوجود اسکے اتحاد اور اس کے فرزندوں کے درمیان دینی اخوت کے فرض ہونے کا یقین، قبلہ رخ نماز پڑھنے والے اور قرآن وحدیث پر ایمان رکھنے والے تمام فرقوں کو ایک امت ماننا۔

۲۳- ہر اس شخص کے تئیں حسن ظن جو توحید ورسالت پر ایمان رکھتا ہو، قبلہ رو نماز پڑھتا ہو، اور عقیدہ کے خلاف اس کا کوئی عمل یقینی طور پر نہ پایا جائے، اصل یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے مسلمان کے حال کو صلاح پر محمول کیا جائے، اور جب تک گنجائش ہو تفسیق وتکفیر سے اجتناب کیا جائے۔

۲۴- دنیا کے مختلف ممالک میں آباد مسلم اقلیتوں کو امت کا ایک حصہ مان کر ان پر توجہ ان کی اس سلسلہ میں مدد کہ وہ اپنے معاشروں میں زندہ وسرگرم عناصر کی حیثیت سے رہیں، ان کی مخصوص فقہ ہو، اور ان کا شعار یہ ہو: دین پر استقامت معاشرہ سے تعلق، لیکن اس میں انضمام نہیں۔

۲۵- مذہبی، نسلی، لغوی، ثقافتی وسیاسی گوناگونی کو قبول کرنا، مختلف تہذیبوں کے درمیان پر امن بقائے باہمی کے رویہ اور ان کے باہمی استفادہ کو تسلیم کرنا۔

• مادی وانسانی ترقی کا حصول، ماحولیات کے تمام عناصر کی رعایت، ہر اس چیز

میں تعاون جو لوگوں کے لئے زندگی کو آسان اور خوبصورت بنائے، نیز اس کام کو عبادت و جہاد فی سبیل اللہ ماننا۔

۲۷- اصلاح وتبدیلی کے علمبرداران نے پسماندگی وفساد کے مقابلہ کی ترغیب دی ہے، پسماندگی امت کی عقل کو اور فساد اس کے ضمیر کو معطل کر دیتا ہے، اصلاح جب ہماری خواہش پر اور ہمارے ذریعہ ہوگی تبھی حقیقی ہوگی، ہر اصلاح کا نقطۂ آغاز ظالم سیاسی نظاموں کی اصلاح ہے اور ہر تبدیلی کی بنیاد انسان کا اپنے اندر تبدیلی لانا ہے۔

۲۸- خدمت اسلام میں سرگرداں تمام صلاحیتوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانا، ان سب لوگوں کا ایک تحریک یا جماعت کے تحت کام کرنا ضروری نہیں ہے، (بلکہ غالباً مفید بھی نہیں ہے)۔ خادمان دین کے درمیان پایا جانے والا اختلاف وتعدد اگر تنوع اور تخصص کا ہو تصادم کا نہیں تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲۹- امت کے حیران کن تہذیبی کارناموں نیز ان فتوحات کا تذکرہ جنہوں نے قوموں کو غلامی سے آزادی دلائی تھی، امت نے علم وایمان کی جامع جو تہذیب تشکیل دی تھی اس کا تعریف کے ساتھ تذکرہ، پدرم سلطان بود اور اپنے مصائب پر رونے پر اکتفانہ کرنا، بلکہ ماضی سے روشنی لے کر حال کو ترقی دینا اور مستقبل کو بہتر بنانا ہماری ذمہ داری ہے۔

۳۰- فقہا کی ضابطہ بندیوں، اصولیین کی اصول سازیوں، محدثین کے حفظ، متکلمین کی ذہانت، صوفیا کی روحانیت، مؤرخین کی روایت، ادبا وشعرا کی بلند خیالی، حکما کے غور وفکر اور سائنس دانوں کے تجربات پر مشتمل اپنے گونا گوں ورثہ کے بہترین حصہ سے استفادہ، لیکن یہ خیال بھی ذہن میں رہے کہ یہ مکمل ورثہ مسلم عقل کا تشکیل کردہ ہے، لہذا معصوم نہیں ہے، قابل نقد ونظر ثانی ہے، اس پر کلام کیا جا سکتا ہے، اس میں ترجیح وتضعیف سے بھی کام لیا جا سکتا ہے، لیکن پوری امت کسی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

IFA Publications

161 - F, Basement, Joga Bai, Post Box No - 9708,
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Tel : 26981327 Email:ifapublication@gmail.com